معاشی ناہمواریوں کا اسلامی علاج

نعیم صدیقی

یہ تقریر جماعت اسلامی (پاکستان) کے سالانہ اجتماع منعقدہ ۶، ۷، ۸، مئی ۱۹۴۹ء میں بطور خطاب عام پیش کی گئی تھی۔ عنوان کے تقاضے جتنے وسیع تھے، تقریر کا وقت اتنا ہی کم تھا، اس وجہ سے بعض حصص کو ساقط کرنا پڑا اور بعض تفصیل طلب مواقع پر بالجبر اجمال سے کام لیا گیا۔ بہرحال تقریر کو مرتب کرتے ہوئے اس کے تشنہ پہلوؤں کی تکمیل اب کر دی گئی ہے۔ (ن۔ ص)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ!

پاکستان میں برطانوی اقتدار اپنے ترکے میں جس معاشی و اقتصادی نظام کو چھوڑ کر رخصت ہوا ہے، وہ پوری طرح سے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ فطرت پر مبنی ہے۔ اس نظام باطل کے اوپر کڑے پہرے قائم ہیں، اس کے گرد قانون کی سنگینیں تنی ہوئی ہیں، اس کے چاروں طرف سرمایہ دارانہ روایات کے خاردار جنگلے لگے ہیں، اور اس کو لٹریچر اور تعلیم کی ایک تہذیب نے اپنی حفاظت میں لے رکھا ہے۔ اس نظام کے جاں نثار محافظ ہمارے وہ بھائی ہیں جن کے ذاتی اور خاندانی مفاد اس کے ساتھ وابستہ ہیں، اور جن کے ذہنوں پر اس نظام کی فوقیت کا تصور انگریزی حکومت نے سالہا سال کی محنت سے مسلط کیا ہے۔

یہ اقتصادی نظام جو ہمارے سروں پر چھایا ہوا ہے، اس سے پاکستان ہی میں نہیں، دنیا کے ہر گوشے میں خطرناک مفاسد پیدا ہو رہے ہیں اور انسانیت ہر جگہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہے۔ اس نظام کا یہ خاصہ ہے کہ یہ افراد اور جماعتوں اور قوموں کو دولت پرست بناتا ہے، یہ دولت کو چند مرکزوں میں سمیٹتا اور اس کی گردش کی حد کو گھٹاتا ہے۔ یہ امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بناتا ہے۔ یہ معاشی ناہمواریاں پیدا کرتا ہے۔ یہ سوسائٹی کو طبقات میں بانٹ کر باہم لڑاتا ہے۔ یہ بین الاقوامی فضا میں جنگوں کے طوفان بپا کرتا ہے، اور طاقتور قوموں کو کمزور قوموں کی صیادی میں مبتلا کرتا ہے۔ نتیجۃً اس نظام کے تحت خدا پرستی، اخلاق، امن و سکون، اخوت و مساوات وغیرہ کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

نظام سرمایہ داری کے مفاسد پر کسی لمبے چوڑے استدلال کی ضرورت نہیں۔ ہم روز اپنی آنکھوں سے اس کے کرشموں

کر دیکھتے ہیں کون سا دل ہے جو اس کی ناوک افگنیوں سے چھلنی نہیں ہو رہا۔ تقویٰ کی کتنی ہی کمائیاں ہیں جو اس نظام کے ہتھکنڈوں کی قربانگاہوں پر بعنوانِ بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ رکوع و سجود کے کتنے ہی حاصل ہیں جو اس نظام کے خداوندوں کی نذر کر دیے جاتے ہیں۔ ایمان و اخلاق کی، اور ذہانت و فطانت کی کتنی ہی متاع ہائے گراں مایہ ہیں جو اس نظام کی منڈی سے روٹی کے چند لقمے خریدنے کے لئے ہر صبح اور ہر شام کو ہماری آنکھوں کے سامنے لٹائی جاتی ہیں۔ کون کر سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ پاکستان کی کتنی ہی معصوم بیٹیوں کی عصمتوں کا خراج اس نظام کے خداوند اس ہر رات کی تاریکی میں وصول کر لیتے ہیں؟ کون اس کا حساب بتا سکتا ہے۔ کہ حسب و نسب اور عزت و آبرو کے کتنے خزانے ہیں جو ہر دن کی روشنی میں اس نظام کے اکابر کے قدموں پر نچھاور کر دیے جاتے ہیں۔ ایک ایک سکے کی خریداری کے لئے کتنے ہی جوہر قابل ہیں جو اپنے آپ کو اس نظام کے چور بازار میں نیلامی کے لئے پیش کرتے ہیں یہاں زندگی کرنے کے لئے انسانوں کے گلے کے گلے ہیں جو گھوڑوں اور بیلوں کا رتبہ قبول کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں یہاں والدین اپنی اولادوں کو سالہا سال تک پالنے پوسنے کے بعد بالکل اسی طرح لا بیچتے ہیں جس طرح گوالے اور گڈریے بھیڑ بکریاں اور گائے بھینسیں قصاب خانوں میں لا کر بیچا کرتے ہیں۔

یہ نظام از سرتاپا ایک مہلک معصیت، ایک مہذب بدمعاشی، اور ایک منظم چور بازاری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ انسانی فطرت اس کو گوارا کرنے سے انکار کرتی ہے۔ اور اس کے خلاف پوری دنیا میں مظلوم عناصر زور کر رہے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے چھ کروڑ باشندوں میں سے چند سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو چھوڑ کر پوری ملت اس نظام سے نجات حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہے۔

مرض کا علاج مرض سے سرمایہ داری اور جاگیرداری کے مفاسد کے خلاف انسانی فکر نے جب زور کرنا شروع کیا تو کمیونزم ان مفاسد کی اصلاح کے لئے میدان میں نمودار ہوا چنانچہ دنیا کے اکثر گوشوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اور خاص طور پر روس کی سرزمین نے اس نووارد طاقت کو پورا موقع بہم پہنچایا کہ وہ اچھی طرح اپنے کمالات کا مظاہرہ کرے۔ لیکن کمیونزم سرمایہ دارانہ نظام کا جو علاج اپنے ساتھ لایا ہے وہ خود مرض سے کم نہیں یہ معالج اصلاح کی ذمہ داری لینے کے بجائے انتقام کا پروگرام ساتھ لاتا ہے۔ یہ بیمار کے روگ کا علاج نہیں کرتا۔ بلکہ اسے اس بات کی سزا دینا چاہتا ہے کہ تو بیمار کیوں ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں جراح کا نشتر نہیں ہے۔ بلکہ قصاب کا چھرا ہے۔ کمیونزم سرمایہ داری کے خلاف چڑھے جذبات کا ایک ہجوم لے کے آتا ہے۔ اور ایک انتہا پسندی کے مقابلے میں دوسری انتہا پسندی کو ابھارتا ہے۔ اس کے پیش نظر مرض کا علاج مرض سے کرنے کی ایک مکروہ اسکیم ہے۔

کیمونزم کے طریق علاج میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ یہ انسان کی اصلاح اندر سے کرنے کے بجائے باہر سے اصلاح کو اس پر جبراً مسلط کرنا چاہتا ہے۔ یہ دولت مند طبقے کے افراد اور محنت پیشہ طبقے کے افراد میں جذبۂ اخوت و تعاون پیدا کرنے کے بجائے ان کو باہم لڑانا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے کے لئے افراد انسانی سے آزادی اور حق ملکیت یا دوسرے لفظوں میں خدا کی عطا کردہ خلافت و نیابت کے شرف کو پوری طرح چھین لینا چاہتا ہے۔ اور انسانی سوسائٹی کو ڈھور ڈنگروں کے ایک گلے کی طرح چند گڈریوں کے حوالے کردینا چاہتا ہے۔ پھر کیمونزم ایک ملک میں اپنی معاشی اسکیم کو جاری کرنے کے لئے لازم سمجھتا ہے کہ وہاں کے نظام اجتماعی کو ایک مرتبہ پوری طرح تہ و بالا کردے۔ اور مذہب، اخلاق، معاشرت اور قانون کی ساری قدروں کو توڑ پھوڑ دے۔ پھر اس "سرخ دین" کا بیت المقدس چونکہ روس میں واقع ہے۔ لہٰذا یہ مجبور ہے کہ جس ملک و قوم کو اپنے اثر میں لے اس پر روسی امپیریلزم کو مسلط کردے۔ ان امور کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سرمایہ داری کے شکنجہ سے نجات پانے کے لئے کیمونزم کے سرخ باد کو قبول کرنا ایک خطرناک حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

<u>ایک سوال</u> ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جو رجحانات کھول رہے ہیں۔ ان کی سربراہی کرنے والوں کو اب جذباتی پن سے الگ ہو کر گہرے غور و فکر سے کیمونزم کا جائزہ جائزہ لینا چاہئے۔ اور خوب اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کرنا چاہئے کہ سرمایہ داری سے نجات پانے کے لئے:

۱:۔ کیا ہم اپنی مسلم سوسائٹی کو افتراق اور تصادم کا لقمہ بننے دیں۔ اور دین و اخلاق اور تمدن و معاشرت کی ان ساری قدروں کو تہ و بالا ہو جانے دیں، جو ہماری اجتماعی زندگی کے لئے دوران خون کی سی حیثیت رکھتی ہیں! کیا ہم مسلم اور مسلم کو روٹی کے بٹوارے پر لڑا مروانے کی اس ترغیب کو جاری رہنے دیں جو کیمونزم کی طرف سے دلائی جارہی ہے! کیا یہاں مسلمان کے چھرے سے مسلمان کی گردن کٹوانے کا کوئی پروگرام ہمیں پھیلنے دینا چاہئے؟

ب:۔ کیا ہمیں پاکستان کی نوخیز مملکت کو اس خطرے میں ڈالنا چاہئے۔ کہ آج جب کہ اس کی قومی اقتصادیات بالکل ابتدائی درجے میں ہیں۔ اس کے ڈاک خانوں کو جلایا جائے۔ اس کی ریل گاڑیوں کو الٹا جائے۔ اس کی پٹڑیوں کو اکھاڑا جائے۔ اس کے پلوں کو ڈائنامائیٹ سے اڑایا جائے۔ اور اس کے خزانوں کو لوٹا جائے؟

ج:۔ کیا اپنی ساری آزادیٔ فکر و عمل کو ہم ان چند افراد کے حوالے کردینے پر تیار ہیں جو ہم چھ کروڑ افراد کو قومی ملکیت کے کولہو کے بیل بنا کر انسانیت کے شرف سے معزول

کر دینا چاہتے ہیں؟

د:- کیا اس جماعت کی پکار پر ہم لبیک کر سکتے ہیں جو علی الاعلان پاکستان کی سرزمین میں سرخ فوجوں کے داخلے کی خوشخبری سنا رہی ہے۔ اور ایک دردناک غلامی کا پیغام دے رہی ہے؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ تو ایک کرخت "نہیں" کے سوا اس کا کوئی اور جواب ایک مسلمان قوم دے ہی نہیں سکتی۔

پھر کمیونزم کا علاج ہمارے لئے اس وجہ سے بھی ناقابل قبول ہے کہ ہم موجودہ معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لئے اس سے بہتر اور پاکیزہ علاج خود اپنے پاس رکھتے ہیں ہم دوسروں کی طبی امداد کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ ہمیں ساری دنیا کے لئے معالج بنایا گیا ہے۔ ہم پورے اسلام پر ایمان لائے ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کی رہنمائی کو موجب فلاح تسلیم کرتے ہیں۔ اسلام اگر نماز روزے کا دین ہے۔ تو وہ سیاسیات و معاشیات کا دین بھی ہے۔ وہ اگر مسجد میں صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ تو یقیناً بنک، کارخانے، کھیت اور بازار میں بھی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ ہم اسلام کے دین پر اگر نکاح و طلاق کے مسائل میں بھروسہ کرتے ہیں تو یقیناً سرمایہ و محنت کے مسائل بھی ہمیں اس کے اصولوں کی صحت پر یقین کامل ہے۔ اور ہونا چاہئے۔

پھر ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کہ ہماری دستور ساز اسمبلی نے اپنی قرارداد مقاصد کے ذریعے پوری ملت پاکستان کی طرف سے یہ بات طے کر دی ہے۔ کہ اب سرزمین پاکستان میں زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح اور ہر پیچیدگی اور ناہمواری کا علاج اسلام کے ان اصولوں کے مطابق کیا جائیگا جن کے مجموعے کا نام کتاب و سنت ہے۔ خدا کی حاکمیت اور اس کی نیابت کے مقام پر فائز ہو جانے اور امانت اقتدار کو اس کی مقررہ حدود کی پابندی میں استعمال کرنے کا اعلان کر دینے کے بعد ہم دستوری طور پر بھی اس بات کے مجاز نہیں رہے ہیں کہ اسلام کے سوا اپنی نگاہیں کسی اور طرف اٹھائیں ــــ!

اب ہمارے سامنے زندگی کے سارے مسائل کا ایک ہی حل ہے ــ اسلام! اسلام ہمیں ان تمام مفاسد سے بچا سکتا ہے جو سرمایہ داری اور کمیونزم میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام بھلائیوں کو پوری طرح قائم کر دیتا ہے جو کسی ناقص شکل میں ان دونوں نظاموں کے اندر مخلوط ہیں۔

اسلام اور اقتصادی اصلاح اسلام چونکہ سالہا سال سے ایک نظام کی حیثیت میں برسرِعمل نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کے

چند متفرق احتیاجن کا تعلق انفرادی زندگیوں سے تھا، لوگوں کے سامنے آسکے ہیں، اس وجہ سے یہ بدگمانی بہت پھیلتی رہی ہے، کہ شاید اسلام اجتماعی مسائل میں مداخلت کا کوئی پروگرام سرے سے رکھتا ہی نہیں اور شائد کچھ لوگ، خواہ مخواہ کھینچ تان کر اس کو سیاسی اور معاشی نظام کی حیثیت دے رہے ہیں۔ واقعہ یہ نہیں ہے۔ سورہ حدید کی ایک آیت میں اسلام کا وہ مقصد بیان کیا گیا ہے جس کے لئے انبیا مبعوث ہوئے۔ کتابیں نازل ہوئیں معرکۂ خیر و شر بپا کیا گیا۔ اور جس کے لئے سیاسی قوت فراہم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا:-

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ
أَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَأَنْزَلْنَا
الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ
وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

ہم نے اپنے رسولوں کو اس لئے دلیل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ اس لئے "الکتٰب" (ضابطہ) اور "المیزان" (حکمت دینی)، کو نازل کیا، کہ انسان عدل پر قائم ہوجائیں۔ اور اسی مقصد کے لئے لوہا پیدا کیا جس میں شدید (سیاسی) قوت مضمر ہے اور لوگوں کے لئے دوسرے فوائد ہیں۔

یہ آیت اپنے مفہوم میں بہت ہی صاف ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ دین کو اللہ تعالےٰ نے صرف اس لئے مرتب کیا ہے۔ اور اس لئے انبیاء کو بھیجا اور کتابوں کو نازل کیا ہے کہ وہ اپنی تبلیغی جدوجہد سے سیاسی قوت فراہم کر کے دین کے نظام اجتماعی کو برپا کریں، اور اس کے تحت انسانوں کو قسط یعنی اجتماعی عدل پر جما دیں۔ ظاہر ہے کہ عدل کا قیام صرف مسجد کی صف بندی میں مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کے سارے معاملات، کو ناہمواریوں سے ہٹا کر راستی و یکسانی پر قائم کر دینا اسلام کا نصب العین ہے۔ یہ بات تو انسانی عقل ہی میں نہیں آسکتی۔ کہ زندگی کے کسی ایک یا چند شعبوں کو دوسرے شعبوں سے الگ کر کے ان میں نظام عدل قائم کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ دوسرے شعبوں میں کیسے ہی مظالم کارفرما ہیں۔ زندگی کے ایک شعبے کا بگاڑ دوسرے تمام شعبوں کو مریض بنا دیتا ہے۔ پس جس طرح کسی جسم میں کوئی حد بندی کر کے ایک طرف بیماری کی حالت برقرار رکھتے ہوئے دوسرے حصے میں صحت قائم کر دینا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کے بعض شعبوں میں فساد اور ناہمواریوں کو قائم رکھ کر بعض شعبوں میں قیام قسط کا پروگرام عمل میں نہیں لایا جاسکتا۔ چنانچہ اسلام اگر قیام قسط کی ... .

دعوت دیتا ہے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ پوری زندگی کے پورے مسائل میں مداخلت کرنے کا پروگرام لے کے آیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں سیاسی قوت کی اہمیت کی طرف واضح اشارہ موجود ہے، جس کو استعمال کرنے کی ضرورت کسی سیاسی و معاشی نظام ہی کے نفاذ اور قیام میں پیش آسکتی ہے۔ اسلام جس طرح خدا اور بندے کے تعلقات میں عدل چاہتا ہے، اسی طرح والدین اور اولاد، شوہر اور بیوی، حاکم اور محکوم، سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور مزارع، تاجر اور گاہک کے تعلقات میں بھی راستی اور انصاف کی روح کو جاری و ساری کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کسی جزئی معاملے میں عدل نہیں چاہتا بلکہ ایک جامع نظام عدل برپا کرنے کے لئے آیا ہے۔

معاشی ناہمواریوں میں اجتماعی ہلاکت | قرآن نے ایک دوسرے موقع پر معاشی ناہمواریوں کو اقوام کی تباہی کا راز قرار دیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ "اذا اردنا ان نھلک قریۃ امرنا[1] مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول فدمرناھا تدمیرا"

ان چند الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک قانون بیان فرمایا ہے کہ جب ہم کسی بستی، کسی جماعت، کسی قوم اور کسی سوسائٹی کی ہلاکت کا فیصلہ کرتے ہیں تو یہ صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ خوش حال لوگ اپنی بڑھتی ہوئی دولت کے نشے میں فسق کرنے پر اتر آتے ہیں۔ اللہ ہمارے قانون عذاب کے تقاضے پورے ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہ عذاب وارد ہو جانا ہے ظاہر بات ہے کہ جس سوسائٹی میں دولت کمانے کے ناجائز طریقے چلنے لگیں، اور کبر اور اسراف کے مظاہر ہوں، اور تقسیم دولت میں ناہمواری ہو۔ وہ سوسائٹی ہر لحظہ عذاب الٰہی کی زد پر رہے گی جس اسلام نے اللہ تعالیٰ کے قانون عذاب اور معاشی ناہمواریوں کے اس تعلق کو واضح کیا ہے، وہ یقیناً انسانی سوسائٹی کو تباہی سے بچنے کے راہ نجات بتانے کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ ہر نبی کی نبوت کا، ہر آسمانی کتاب کی ہدایت کا اور ہر اسلامی حکومت کے ذرائع و وسائل کا ایک واضح ہدف یہ ہے کہ وہ دولت کمانے اور خرچ کرنے کے طریقوں میں "فسق" پیدا ہونے میں مانع ہوں تاکہ وہ ناہمواریاں نہ پھیلنے پائیں جو ایک ملک یا مملکت کو تباہی کی طرف لے جاتی ہیں۔

ایمان و اخلاق کی حفاظت کی ذمہ داری | یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی جسے نبی صلعم نے خود بیان فرمایا ہے

[1] "امرنا" کے معنی بعض مفسرین متقدمین نے "کثرنا" کے لفظ سے کئے ہیں، یعنی چند خوش حال لوگوں کی دولت غیر فطری حد تک بڑھنے لگتی ہے۔

کہ ایک طرف کثرت مال مسلمانوں کے ایمان و اخلاق کے لئے خطرہ ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف افلاس ان کو دھکیل کر کفر کے قریب لے جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے اسلامی سوسائٹی اور اسلامی حکومت اور نظام اسلامی کا اگر یہ بنیادی فریضہ ہے۔ کہ وہ ایک ایک مسلمان کے ایمان و اخلاق کی حفاظت اور پرورش کا اہتمام کرے تو یقیناً اس کے لئے معاشی ناہمواریوں کے خلاف پوری طرح جدوجہد کرنا لازم ہے۔ اسلامی سوسائٹی کے ہر دوسرے دائرے کی طرح معاشی دائرے میں بھی یہ بات ضروری ہے کہ ہر مظلوم کو ظلم سے بچا کر اور ظالم کو ظلم سے روک کر اس کی مدد کی جائے۔ تاکہ کوئی فرد دنیوی اور اخروی فلاح سے محروم نہ ہونے پائے۔

اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اسلامی نظام ایسی فضا میں صحیح طور پر پنپ ہی نہیں سکتا جس میں معاشی ناہمواریوں نے باشندوں کی اکثریت کو پیٹ کے مسئلے میں اس بری طرح بتلا کر دیا ہو کہ وہ اپنے وقت اور مال میں سے کوئی حصہ زندگی کے اہم تر تقاضوں کے لئے نکال ہی نہ سکیں۔ اور اجتماعی مسائل میں صرف چند خوشحال افراد ہی کو حصہ لینے کا موقع مل سکے۔ پس اسلامی نظام کے قیام و استحکام کا تقاضا بھی یہی ہے کہ معاشی ناہمواریوں کے خلاف باقاعدہ جدوجہد کی جائے۔

<u>خلیفہ اول کی خلافتی پالیسی</u> ان اشارات کو میں نے عرض کیا ہے ان کی اہمیت کو سب سے بڑھ کر نبی صلعم کے خلیفہ اول نے محسوس کیا تھا۔ اور اپنے نظام خلافت کی پالیسی کو منبر خلافت سے واضح کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ

> تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے۔ یہاں تک کہ دوسروں کا حق میں اس سے وصول کر لوں۔ اور تم میں سے ہر ضعیف میرے نزدیک قوی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا حق اس تک پہنچا دوں۔

آج بھی اگر کسی گوشۂ ارضی میں نظام اسلامی کا قیام ہوگا تو اس کی پالیسی اسی اصول انصاف پر مبنی ہوگی کہ وہ حق سے زائد وصول کرنے والوں سے دوسروں کے حقوق سلب کرے اور حق سے کم پانے والوں کو ان کے حقوق پہنچائے۔ یہ نظام جس طرح سیاست اور معاشرت میں ناہمواریوں کو برداشت نہیں کر سکتا، اسی طرح یہ معاشی ناہمواریوں کو بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ پس ایک مسلمان فرد اور جماعت اور حکومت اگر معاشی ناہمواریوں کے استیصال کے لئے کمربستہ ہوتی ہے تو وہ اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ دنیا میں اس کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے۔ یا کمیونزم کی روک تھام کے لئے اور اس کی تیرہ دستیوں سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے، بلکہ یہ کام تو اس لئے کرنا ضروری ہے کہ یہ خود اسلام کے پروگرام میں

اپنے کنبہ اور عیال کا خرچ اسے دے دیا جائے، اس کے علاوہ وہ باقی مسلمانوں کے برابر ہے۔ عہدہ داروں سے عہد لیتے کہ ترکی گھوڑے پر سواری نہ کرنا، میدہ اور چپاتی نہ کھانا اور حاجتمندوں پر اپنے دروازے بند نہ کرنا۔

امیر معاویہ کا قول ہے: "ابوبکر لم یرد الدنیا ولم تردہ واما عمر فارادتہ ولم یردھا واما نحن فتمرغنا فیہا ظہرا لبطن" (البدایہ) ابوبکرؓ نہ دنیا چاہتے تھے اور نہ دنیا نے انہیں چاہا، عمرؓ کو دنیا نے پسند کیا لیکن عمرؓ نے دنیا کو ناپسند کر دیا، ہم تو دنیا میں لت پت ہو گئے۔ استغنا کی یہ کیفیت ہے جو اسلامی حکومت کے لئے امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور کتنا جامع تجزیہ ہے جو دونوں خلفاء کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

احساس ذمہ داری اور جذبۂ خدمت حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "لوان جملًا هلك بشط الفرات لخشیت ان یسئل اللہ عنہ ابن الخطاب" اگر فرات کے کنارے پر اونٹ مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ عمرؓ کو اس کی بابت پوچھا جائے گا۔ طلحہ بن عبداللہ فرماتے ہیں حضرت عمرؓ ایک رات ایک مکان میں تشریف لے گئے، مجھے بدگمانی ہوئی میں صبح اس مکان میں گیا وہاں ایک اندھی بوڑھی بے دست وپا عورت رہتی تھی، میں نے اس سے پوچھا تمہارے پاس رات کوئی آیا تھا؟ اس نے کہا یہ شخص مدت سے رات کو آتا ہے، میرا سامان سلیقہ سے رکھ جاتا ہے، مکان صاف کر کے کوڑا باہر ڈال جاتا ہے، طلحہ فرماتے ہیں، میں بہت شرمندہ ہوا کہ میں عمرؓ کے عیب تلاش کرتا ہوں؟

ایک رات حضرت عمرؓ مدینہ کے اطراف میں دوڑ رہے تھے، حضرت علیؓ نے وجہ دریافت کی، فرمایا بیت المال کے کچھ اونٹ گم ہو گئے ان کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے قبیلہ خزاعہ کا رجسٹر نکالا، اس کی بیوہ اور کنواریوں کے نام درج تھے، خلیفہ نے ہر ایک کا وظیفہ اس کے ہاتھ میں دیا۔ فرمایا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ہر علاقہ کا دورہ خود کروں اور مصیبت زدہ لوگوں کی شکایات خود سنوں۔ مجھے گمان ہے کہ حکام تساہل کرتے ہیں اور شکایات مجھ تک نہیں پہنچاتے۔

اسی فرض شناسی اور رعایا پروری کا یہ اثر تھا کہ لوگ حضرت عمرؓ سے بہت ڈرتے تھے "لم یکن عمر یستعمل الا الدرۃ وھی عصا صغیرۃ کالمخصرۃ کانت دائما فی یدہ اذا سار وکان الناس یھابونھا اکثر مما تخیفھم السیوف" (العاطمۃ محاضرات ۲-۲۲) حضرت عمرؓ کا درہ ایک چھوٹی سی چھڑی تھی جو آپ کے

کے وہ تمدن کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ ایک شخص کسی کھلے جنگل میں داخل ہو کر جنگلی پھلوں سے جس بے تکلفی سے استفادہ کرتا ہے، وہ بے تکلفی وہ کسی ایسے باغ میں استعمال نہیں کر سکتا جس کے متعلق اسے معلوم ہو جائے، کہ اس کا کوئی مالک ہے۔ یہ محض زاویۂ نظر کا فرق ہے جس نے دونوں مواقع پر طرزِ عمل میں فرق پیدا کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح دنیا اور انسان کے متعلق مختلف اعتقادات مختلف طرزِ عمل پیدا کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھنے سے قدرتی طور پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نظام سرمایہ داری کے مفاسد کی اصل جڑیں وہ باطل معتقدات ہیں، جنہوں نے دنیا کو مادے کا کرشمہ، انسان کو حیوان، اخلاق کو نفس پرستی، اور تمدن کو انسانی طبقات کا اکھاڑہ قرار دیا ہے۔ بخلاف اس کے اسلام آدمی کو ایک ایسا زاویۂ نظر دیتا ہے، جس سے اس کے طرزِ عمل میں صدور جہ کا ذمہ دارانہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔

قرآن صحیفۂ فطرت سے اخذ کردہ دلائل کا ایک انبوہ اس سچائی کو واضح کرنے کے لئے جمع کر دیتا ہے کہ کارخانۂ کائنات میں جو نظم، قانون، حسن اور ارتقا پایا جاتا ہے یہ ایک با اختیار خالق، ناظم اور حاکم کا کرشمہ کار ہے۔ اس کارخانے میں مادر پدر آزادی کی کوئی جگہ نہیں چنانچہ وہ دوسری صداقت یہ سامنے لاتا ہے کہ انسان خالقِ کائنات کا عبد، خلیفہ اور ایجنٹ ہے پھر وہ بتاتا ہے کہ جس طرح دنیا کے تمام موجودات کے لئے ضابطہ کار فرما ہے اسی طرح انسان کو جو شعور و اختیار دیا گیا ہے اس کے استعمال کے لئے بھی ضابطہ ہے جسے خدا کے انبیا لاتے رہے ہیں۔ پھر وہ بتاتا ہے۔ کہ یہ ارضی زندگی جس دائمی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے برا یا بھلا ہونے کا دارومدار موجودہ آزمائشی زندگی کے صلاح و فساد پر ہے۔

یہ تصورِ حیات اور عقیدۂ زندگی اس طرزِ عمل کی بنیاد بننے کے لئے قطعاً ناساز گار ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت افرادِ انسانی میں پیدا ہو جاتا ہے۔

نظام معاشیات اور اسلامی عقائد یہ بنیادی عقیدۂ حیات جسے میں نے بیان کیا ہے، زندگی کے ہر شعبے کے لئے کچھ تفصیلی عقائد بھی مہیا کرتا ہے، چنانچہ اسلامی نظام معیشت میں افراد کی جدوجہد بعض خاص اعتقادی حدود کی پابند رہتی ہے، اور یہ ضروری ہے کہ ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے:

۱- خدا کی رزاقی ـــــــ اسلام نے انسان کو پورا اطمینان دلایا ہے۔ کہ جس خدا نے تجھے پیدا کیا ہے اس نے تیری ضروریات کا انتظام بھی کیا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا زمین میں حرکت کرنے والا

کوئی ایسا جاندار نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے نہ لے رکھی ہو۔ پھر فرمایا خَلَقَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ زمین و آسمان میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے، وہ تمہاری ہی ضروریات پوری کرنے کیلئے ہے۔ دراصل اس عقیدہ کو ذہنوں میں اتارنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسانوں میں اوچھا پن، کم ظرفی اور اس سے بڑھ کر رزق کے لئے ہاتھا پائی کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔ انہیں بھروسہ ہونا چاہئے کہ خزانوں کا ایک مالک خود ان کی ضروریات کی فراہمی کا ضامن ہے۔

۲۔ تفاوتِ رزق میں آزمائش ——— یہ ظاہر ہے کہ فطرت میں یہ پہلو ہے: اختلاف اور تفاوت کارفرما ہے چنانچہ افرادِ انسانی کی قابلیتوں میں، اپنی صلاحیتوں، جسمانی قوتوں اور پیدائشی اور اکتسابی سہولتوں کے لحاظ سے گوناگوں اختلافات ہیں جو نظامِ تمدن میں اپنا کام کرتے ہیں۔ صلاحیتوں کا اختلاف جدوجہد میں اور جدوجہد کا تفاوت کمائیوں میں تفاوت پیدا کرتا ہے۔ اس تفاوت کے متعلق قرآن بیان کرتا ہے کہ اس کے ذریعے انسان کو خیر و شر کے ایک امتحان سے دوچار کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی بھلائیوں اور برائیوں کو نمودار کر سکے۔ فرمایا۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ

خدا وہ ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں کی فوقیت اس لیے دی کہ وہ اپنے عطیات کے بارے میں تمہیں جانچے۔

اس ارشاد سے اللہ تعالیٰ کا مدعا یہ ہے کہ تم زمین میں شتر بے مہار بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو، بلکہ تم ہمارے نائب اور ہمارے مقرر کردہ کارندے ہو اور تمہارا کام بے لگامی سے دنیا میں تصرف کرنا نہیں ہے، بلکہ رزق کے حصول و صرف میں ہماری رضا اور ہمارے قانون کو پوری طرح ملحوظ رکھنا ہے۔ ہم نے تم کو جو ذرائع و رسائل اور حصۂ دولت دیا ہے اس کے ذریعے ہم تمہاری آزمائش کرنا چاہتے ہیں کہ تم کیا رویہ اختیار کرتے ہو۔ یہ حصۂ دولت اور یہ ذرائع و رسائل خدا کی اطاعت اور نوعِ انسانی کی خدمت میں صرف ہوتے ہیں۔ یا خدا سے بغاوت کرنے اور اس کے بندوں کو محروم سے محروم تر بنانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ زیادہ حصہ پانے والے کا امتحان اس بات میں ہے کہ وہ کم پانے والے کے متعلق اپنی ذمہ داری کو کس حد تک محسوس کرتا ہے۔ اور کم پانے والوں کا امتحان اس بات میں ہے کہ وہ زیادہ پانے کے لئے خدا تعالیٰ کی حدود کو توڑتے نہیں

۳- محاسبہ اور جواب طلبی کے تصور سے امتحان کے تصور کی تکمیل کے لئے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ایک دن زندگی کی ساری سرگرمیوں اور معاشی جدوجہد کے سارے ہنگاموں کا باقاعدہ محاسبہ بھی ہونا ہے اور تفاوتِ رزق نے جو ذمہ داریاں نوعِ انسانی پر ڈال دی ہیں۔ ان کے بارے میں جواب طلبی بھی ہونی ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ "لَتُسْئَلُنَّ عَنِ النَّعِيمِ"، تم سے ان تمام نعمتوں کے بارے میں باز پرس ہوگی جو تمہیں تفویض کی گئی تھیں۔ کہ ان کا استعمال کن مقاصد کے لیے کیا گیا۔ اور آیا ان کا حق شکر ادا کیا گیا یا نہیں؟

معتقدات کا جوہر ان سارے معاشیاتی معتقدات کا جوہر ایک آیت میں سمیٹ دیا گیا ہے:۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّ
زِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ
وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ
نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ
يَكُوْنُ حُطٰمًا ــــــــــ
ــــــــــ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ
شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝
سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ
اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۔

جان لو کہ (خدا اور آخرت سے بے نیاز) دنیوی زندگی ایک کھیل کود ہے ایک سجاوٹ ہے اور تمہاری آپس کی مفاخرت، (اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ایک جدوجہد ہے جس کا حال اس کھیتی کا سا ہے جس کی روئیدگی دہقانوں کا دل لبھاتی ہے پھر وہ شباب پہ آتی ہے۔ اور تم اسے پک کر زرد ہوتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اور پھر کسی جائے ناگہانی سے وہ بھس بن کے رہ جاتی ہے ــــــــــ اور دوسری طرف، آخرت (کی زندگی) ہے جس میں (کسی کے لئے) عذاب شدید ہوگا (اور کسی کے لئے) اللہ کی رضا و مغفرت ہوگی۔ تو پھر دنیا کی زندگی (کی حقیقت) کیا ہے۔ بجز اس کے کہ دھوکے کی ٹٹی ہے۔ لپکو اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی اس جنت کی طرف جس کی وسعتیں ایسی ہیں جیسے آسمان و زمین کی پہنائیاں، اور جسے اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ زندگی کا ایک ڈھنگ تو یہ ہے کہ دولت کے کمانے اور معاشی فوقیت کی جدوجہد کرتے ہیں آدمی اپنی تاریک ذمہ داریوں سے آنکھیں بند کر کے کھو جائے۔ اس طرز پر جو زندگی کائنات کے مالک و حاکم کے منشا سے آزاد ہو کر اور آخرت کی جواب طلبی سے بے نیاز ہو کر بسر کی جائے گی۔ اس کی حیثیت ایک فصل کی عارضی سرسبزی کی سی ہے جو آخر کار یکایک تباہ ہو کے رہ جاتی ہے۔ اور کسان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ زندگی بسر کرنے کا دوسرا ڈھنگ یہ ہے کہ آدمی ساری معاشی سرگرمیوں میں اپنی نگاہیں آخرت کی عدالت کے محاسبہ پر اور اس کے نتیجے میں ملنے والی دوامی زندگی پر جمائے رکھے۔ اس طرز پر جو زندگی استوار ہو گی اس میں ساری مسابقت خدا تعالیٰ کی عبادت اور اخلاقی ارتقا اور نوع انسانی کی سچی خدمات کی انجام دہی میں ہو گی۔ اسلامی معتقدات اسی طرز زندگی کو ابھارنے والے ہیں ظاہر ہے کہ اس طرز زندگی اور سرمایہ دارانہ طریق حیات میں نہایت درجہ کھلا تضاد موجود ہے۔

اسلامی عقائد کی تجدید کی ضرورت یہ اسلامی معتقدات جو انسانوں کے معاشی تعلقات پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ مدتوں کی ناسازگاریٔ ماحول کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں ٹھٹھر گئے ہیں۔ ان معتقدات کی نہ آبیاری ہوئی۔ نہ ان کی تربیت کا کوئی تسلی بخش انتظام ہو سکا۔ نہ ان کی حفاظت کے لوازم فراہم کئے گئے چنانچہ ان معتقدات کا چرچا باقی ہے۔ لیکن ان میں اتنی جان نہیں رہی کہ یہ افراد کی عملی زندگیوں پر اثر انداز ہو سکیں۔ اب اگر پاکستان میں اسلامی نظام معیشت کو استوار کرنا ہو تو یہاں کی حکومت کو سب سے پہلے اسلامی عقائد کی تجدید پر پورا زور صرف کرنا پڑیگا۔ آج اگر نظام تعلیم، ریڈیو، سینما، لٹریچر اور اخبارات، خطیب اور مقررین، ائمۂ مساجد اور سیاسی ورکر ان عقاید کے بحال کرنے کیلئے اور اسلامی زاویۂ نگاہ کے احیاء کے لئے ہمہ تن مصروف ہو جائیں تو وہ تین سال کے اندر ہمارے ملک کی اکثریت کی ذہنیتیں اسلامی سانچے میں ڈھل سکتی ہیں۔

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ اگر ہمارے معاشرہ کے افراد کی ایک بڑی تعداد اسلام کے معاشی معتقدات کو پوری طرح اپنے اندر پیدا کرے۔ تو یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے جونک بننے کی ذلت اختیار کر سکے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے کاروبار کی گاڑی میں گھوڑے اور گدھے کی طرح جوتنے پر تیار ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی گردن پر "شیخ تسمہ پا" بن کر سوار ہو۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ دولت مند مسلمان غریب مسلمانوں کو اپنا لقمہ بنانے کے لئے معاشیات کے سمندر میں ماہی گیری کرتے نظر آئیں

۲۔ تعمیرِ اخلاق

لیکن اسلام عیسائیت کی طرح صرف چند عقاید قبول کرنے کے لئے سفارش کر کے الگ نہیں ہو جاتا، بلکہ ان کے پورے استحکام کے لئے اور ان کو عملی زندگی میں مؤثر بنانے کے لئے عباداتِ خمسہ کا تربیتی پروگرام اختیار کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے پیش کردہ عقائد پر افراد کی ایک نئی معاشی سیرت تعمیر کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسلام کی تعمیر اخلاق کی اس اسکیم کا آپ کے سامنے تعارف کرا دوں جس کے بغیر اسلام کے معاشی نظام کی امتحان ہو ہی نہیں سکتی۔

زندگی کا اونچا نصب العین معاشی اخلاق کی تعمیر میں اسلام نے اولیں اہمیت اس چیز کو دی ہے کہ وہ مسلم سوسائٹی کے ایک ایک فرد کے سامنے زندگی کا ایک وسیع اور اونچا نصب العین الیسا رکھتا ہے جو اسے معاشی حیوان کے درجے تک نہ گرنے دے اور اس کا جینا کھانے کیلئے نہ ہو، بلکہ کھانا جینے کے لئے اور جینا اعلیٰ تر منتہا کے لئے ہو۔ قرآن نے ایک مسلم کی اصل ذمہ داری کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم وہ بہترین امت (پارٹی) ہو جسے نوعِ انسانی
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	کی خدمت کے لئے برپا کیا گیا ہے، سو تم بھلائی
	کا حکم کرنے والے اور برائی کو روکنے والے ہو۔

یہ آیت ہر فرد مسلم کو زندگی بھر کے لئے ایک ڈیوٹی پر مامور کرتی ہے۔ کہ وہ اپنے زیادہ سے زیادہ وقت اور مال و قوتوں کو نوعِ انسانی کی صلاح و فلاح کے لئے استعمال کرے۔ اس عالمگیر اور دوامی ذمہ داری کا احساس جن رگوں میں نشوونما پا لیتا ہے، ان کے لئے دولت سمیٹنے سکے گننے رہتے، اور عیاشی اور تفریحات میں اپنے آپ کو مصروف کر دینے کا کوئی موقع نہیں۔ رہتا یہ اسی اونچے نصب العین کا فقدان ہے۔ جس نے مغربی اقوام میں سرمایہ داری کو نشوونما دی ہے۔ اور اسی نصب العین کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد ہی ہماری سوسائٹی میں وہی سرمایہ داری کو فروغ پانے کا موقع ملا ہے۔ اسلام خدمتِ انسانیت، کے مقصدِ اعلیٰ کے لئے ایک ایک مسلم فرد کو ایسا سپاہی بنا دینا چاہتا ہے جو نیکی کی ہر شکل کو غالب کر دینے کے لئے برائی کی ہر شکل سے برسرپیکار ہے۔ ان سپاہیوں کو یقیناً اپنی ذاتوں کی بحالی کے لئے رزق کی ضرورت ہے۔ لیکن خیر و شر کی جنگ میں عین موقع

پر آنے کے بعد ان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ اپنی ساری توجہ کھانے پینے کے مسائل پر صرف کر دیں خدا کی نیابت وخلافت کی بھاری ذمہ داری کو محسوس کر لینے کے بعد کسی مسلم کے لئے اس کا موقع کہاں کہ وہ اپنی ساری زندگی کو معدے کے محور پر گھماوے۔ اور ایک جانور کی طرح دن رات چارے اور گھاس کے پیچھے پڑا رہے۔

معاشی جدوجہد میں پابندئ حدود ایک اونچا نصب العین انسان کے سامنے رکھ دینے کے بعد اسلام اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے۔ کہ ضروریات پوری کرنے کے لئے جو جدوجہد کی جائے۔ اس میں اخلاقی حدود کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا جائے۔ اپنے حصے کا رزق حاصل کرنے کے لئے وہ دوسروں کی حق ماری کرنے سے روکتا ہے۔ اور یہ احساس پیدا کرتا ہے۔ کہ کمائی کی کوشش بھلے طریق سے کی جائے قرآن نے انبیا کو اور ان کی معرفت ہر فرد مسلم کو یہ ہدایت دی ہے۔ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا۔ یعنی اپنا رزق طیبات تک محدود رکھو۔ اور عمل صالح پر کاربند رہو۔ اسلام کے پورے معاشی فلسفہ کا جوہر ان چند لفظوں میں سمٹ گیا ہے۔ مدعا یہ ہے۔ کہ حصول رزق میں پورا اہتمام اس بات کا ہونا چاہیئے کہ طیبات حاصل ہوں۔ روزی پاکیزہ ہو، ذرائع اور وسائل جائز قسم کے ہوں۔ اور ساری معاشی جدوجہد میں "عمل صالح" کی پابندی کی جائے۔ اس آیت کو مدتہائے مدید سے پامال کیا جا رہا ہے اور اس میں جس معاشی اخلاق کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ عملی زندگی سے بے دخل ہو چکا ہے۔ آج رزق اور ذرائع و وسائل طیبات کی جگہ محرمات اور مکروہات پر مشتمل ہیں۔ اور دولت کی ساری قوت عمل صالح کی جگہ مفسدات کے فروغ میں صرف ہو رہی ہے اور اسی نامطلوب حالت کے موجود ہونے کا نام سرمایہ داری ہے۔

نبی صلعم نے قرآن کے اسی مدعا کو اَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ کے کلمات میں سمویا ہے یعنی حصولِ رزق کی مساعی میں اخلاقی جمال برقرار رہنا چاہیے۔

اصول کفاف کی ترغیب نبی صلعم نے فرمایا کہ :۔

أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَكَانَ رِزْقُهُ كِفَافًا — فلاح پائی اس نے جو اسلام پر کاربند ہوا اور جس نے رزق کفاف پر گذر کی۔

پھر آنحضور نے خدا سے یہ دعا کی کہ :۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْ آلَ مُحَمَّدٍ كِفَافًا — اے اللہ! آلِ محمد کو رزق کفاف عطا فرما۔

رزق کفاف سے مراد یہ ہے کہ آدمی کو اتنی روزی حاصل ہو جائے کہ وہ ایک مسلم کی ایمان، اخلاق، اور آبرو سے بھری ہوئی زندگی بسر کرنے کے لئے روزمرہ کی ضروریات کو بخوبی پورا کر سکے۔ اور زائد از ضرورت رزق کو جمع رکھ چھوڑنے سے بے نیاز رہ سکے۔ اوپر فرد کی جو ذمہ داری بیان کی گئی ہے اس کے تقاضے اگر کسی کے پیش نظر ہوں تو وہ رزق کفاف سے زیادہ کمانے کے لئے وقت نکال ہی نہیں سکتا۔ اور نکال لے تو عمل صالح کی پابندی کے ساتھ طیبات پر اکتفا کرنے کی صورت میں وہ تجوریوں کو بھرنے کی کوئی مہم لے کے چل ہی نہیں سکتا۔ ایک مسلم فطرۃً مجبور ہے کہ وہ رزق کفاف پر نگاہ جمائے۔ اور معاشی جدوجہد سے جتنا وقت اور جتنی قوتیں بچا سکے وہ خدا کی عظیم تر عبادات کے انجام دینے اور انسانیت کی خدمت میں صرف کر دے۔ لیکن اگر کسی شخص کی قوتیں دولت پیدا کرنے ہی کے لئے خاص ہوں تو اس کے لئے بھی فلاح کا محفوظ ترین راستہ یہی ہے کہ وہ اپنی کمائی میں سے رزق کفاف اپنے لئے رکھ لے اور بقیہ مال کو دوسرے افراد اور معاشرہ اور نظام اسلامی کی خدمت کے لئے صرف کرے۔ اسلامی قانون کا نہ سہی اخلاق کا تقاضا یہی ہے۔

نبی صلعم کے صحابہ کرام کا مسلک یہی تھا کہ وہ حصول رزق پر اول تو توجہ ہی کم سے کم ضروری حد تک دیتے تھے اور اگر اللہ کا فضل ضروریات سے زیادہ ہوتا تو اسے اسلام اور مسلمانوں کی ضروریات میں صرف کرنے کے لئے تیار رکھتے تھے۔ اسی اخلاقی مسلک کو حضرت ابوذرؓ نے قانون کی حیثیت دینی چاہی تھی، لیکن حضرت عثمان نے اخلاقی قانون کو عدالتی قانون بنانے سے بجا طور پر انکار کر دیا تھا۔ تاہم حضرت ابوذرؓ جس مسلک کفاف کے داعی تھے وہ بجائے خود ایک اہم اخلاقی اصول ضرور تھا۔ اور یہ اصول ایک مسلم کے پیش نظر رہنا چاہئے۔

اسلام کو خزانے جمع کرنے اور سکوں کی گنتی کرتے رہنے کی ذہنیت ہی سرے سے نامرغوب ہے چنانچہ قرآن نے جابجا اسے کراہت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ایک جگہ کہا کہ:-

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ — غفلت میں مبتلا کر دیا ہے تم کو مال بڑھانے کی جدوجہد نے یہاں تک کہ تم قبروں میں جا اترو۔

دوسری جگہ زر پرستانہ کردار کو پیش کیا کہ:-

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ الَّذِي جَمَعَ — تباہی ہے ہر اس طعن باز عیب چیں کے لئے جس نے

مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ ۝ — دولت سمیٹی اور پھر اسے گن گن کر رکھا اور سمجھتا ہے کہ اُس کی دولت ہمیشہ اُس کا ساتھ دے گی!

جس معاشی ذہنیت و کردار کو ان آیات میں مکروہ کر کے دکھایا گیا ہے، اسے ترک کرنے کے بعد لازماً اصولِ کفاف ہی کا اخلاقی مسلک باقی رہ جاتا ہے۔ یہ مسلک اگر کسی سوسائٹی میں رائج ہو تو اس میں معاشی ناہمواری کا برقرار رہنا ناممکن ہے۔

ترغیبِ انفاق: اصولِ کفاف کے اندر در اصل انفاق کا اصول خود شامل ہے۔ اسلام اپنے زیر اثر لوگوں سے بہت ہی شدت سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ غلبۂ دین کے لئے اسلامی حکومت اور اسلامی سوسائٹی کے لئے اور ضرورتمند افراد کی شخصی امداد کے لئے اپنے مال صرف کریں۔ قرآن کی لرزا دینے والی آیات میں سے آیتِ کنز بھی ایک ہے۔ فرمایا:۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ — اور جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کر رکھتے ہیں اور اُن کو اللہ کی راہ میں صرف نہیں کرتے، اُن کو خوشخبری سنا دیجئے عذابِ الیم کی!

چنانچہ یہ خوشخبری ان الفاظ میں سنائی گئی:۔

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ — پس (سونے چاندی کی ٹکیوں کو تپا تپا کر اُن) سے اُن کی پیشانیوں اور اُن کے پہلوؤں کو داغا جائے گا۔

پھر اربابِ بخل کے بارے میں فرمایا کہ:۔

لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ — کنجوسوں کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ اللہ نے ان کو جو مال دے رکھا ہے وہ کیسا ہی سفید ہے، نہیں وہ ان کے لئے سخت ہے، قیامت کے دن اُن کی کنجوسی کا سارا حاصل طوق (طوقِ لعنت)

بنا کر ان کی گردنوں میں لٹکایا جائے گا۔

یہ وہ آیات ہیں جنہوں نے صحابہ کرام کے دلوں کو جھنجوڑ دیا تھا اور وہ مضطرب ہو ہو کر یہ معلوم کرتے تھے کہ ان کو اپنے مالوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اور یقیناً ان وعیدوں کو معلوم کر کے ایک مسلم کا حال یہی ہونا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ آیت کنز میں اکتناز کی جو انتہا بیان کی گئی ہے، ادائے زکوٰۃ کی صورت میں وہ باقی نہیں رہتی۔ لیکن یاد رہے۔ کہ صرف زکوٰۃ دینے سے حق انفاق ادا نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ تو ایک قانونی مطالبہ ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے اخلاقی مطالبات بھی ہیں۔ اور ان کو پورا کئے بغیر آدمی کو اپنی عاقبت کے متعلق مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے۔ نبی صلعم کی تصریح ہے۔ کہ:-

إِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں خدا اور بندوں کے حقوق ہیں۔

ان حقوق کی ادائی کے طریقے کو ایک دوسری حدیث واضح کرتی ہے۔ حضرت ابوذر کا بیان ہے۔ کہ نبی صلعم ایک مرتبہ دیوار حرم کے سائے میں تشریف رکھتے تھے۔ اور بیٹھے بیٹھے آپ نے فرمایا:-

"هُمُ الْأَخْسَرُونَ" وہ لوگ سخت خسارے میں ہیں، سخت خسارے میں ہیں حضرت ابوذر نے پوچھا کون یا رسول اللہ؟ فرمایا جو لوگ مال و دولت کے انبار جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر اس کو آپ نے اپنے ہاتھوں سے چاروں طرف کو پھینکنے کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، یوں اور یوں خرچ نہیں کرتے۔ یہ ہے "حقًّا سِوَى الزَّكَاةِ" کی حقیقت۔ اہل دولت زکوٰۃ دینے کے بعد فارغ نہیں ہو جاتے، بلکہ اسلامی نظام حکومت، اسلامی سوسائٹی اور افراد مسلم کی بے شمار ضروریات ان سے ہر وقت مطالبہ کرتی ہیں۔ کہ أَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا!

احادیث تو یہاں تک لے جاتی ہیں کہ قیامت کے روز خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے کہے گا میں جب حاجتمند بن کر تمہارے پاس پہنچا۔ تو تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ بندے تعجب سے پوچھیں گے۔ کہ آپ تو کیسے ضرورتمند ہو سکتا ہے؟ خدا فرمائے گا۔ کہ میرا فلاں فلاں بندہ چونکہ میرا بھیجا ہوا تھا۔ لہذا تم نے اس سے جو سلوک کیا، وہ مجھی سے کیا تھا! اس کے صاف معنی یہ ہیں۔ کہ اسلامی حکومت، سوسائٹی اور افراد مسلم کی ہر ضرورت کا مطالبہ دراصل براہ راست اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہے۔ اور ان مطالبات کے جواب میں زکوٰۃ دے دینا ہرگز کافی نہیں ہو سکتا۔

انفاق العفو انفاق کے مطالبات کی وسعت کے پیشِ نظر صحابہ کی سوسائٹی میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا خرچ کیا جائے اور کتنا خرچ کیا جائے؟ اسی سوال کو قرآن نے دہرایا کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ (لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟) قُلِ الْعَفْوَ (جواب میں کہہ دیجئے کہ "العفو") العفو بچتوں اور فاضلات کو کہتے ہیں اور انفاقِ العفو سے مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد کی بچتوں اور فاضلات کو خدا کی راہ میں اس وقت تک صرف کرنا چاہیئے۔ جب تک کہ ان کے مصرف موجود ہوں۔

یہ چیز مسلم ذہنیت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ کہ اسلامی حکومت کا خزانہ دم توڑ رہا ہو۔ یا سوسائٹی کی ضروریات اٹکی ہوئی ہوں یا مسلمان بیوائیں اور یتیم بچے اور مزدور پیشہ مساکین فاقہ اور بیماری میں مبتلا ہوں اور دوسری طرف روپیہ بچا بچا کے رکھا جا رہا ہو، یہی وہ بخل ہے جس کے طوق گلو بننے کی وعید سنائی گئی ہے پھر "العفو" کا دائرہ روپے پیسے غلے اور استعمالی اشیا ہی تک وسیع نہیں ہے بلکہ اگر کسی شخص کے پاس قوت فاضل ہے دماغی جسمانی قوت فاضل ہے تو اس کو اسی کا انفاق کرنا چاہیئے۔ چنانچہ نبی صلعم نے فرمایا کہ صدقہ ہر مسلم پر واجب ہے (مسلم بخاری) پوچھا گیا۔ اگر کسی کے پاس کچھ مال ہی نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ فرمایا ہاتھ سے محنت کر کے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے پھر سوال ہوا کہ اگر وہ محنت کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر فرمایا محتاج اور مظلوم کی ممکن امداد کرے پوچھا گیا۔ کہ اگر یہ بات بھی استطاعت سے باہر ہو تو؟ فرمایا نیکی کی نصیحت ہی کرتا رہے پھر پوچھا گیا، کہ اگر یہ بھی نہ کر سکے؟ تو فرمایا دوسروں کو شر پہنچانے سے باز رہے، تو یہ بھی ایک طرح کا صدقہ ہے ـــ یہاں تک کہ نبی صلعم نے صدقہ کی اصطلاح کو اتنی وسعت دی ہے کہ راستے سے کانٹا ہٹا دینا صدقہ ہے کسی کا بوجھ اٹھا دینا صدقہ ہے راستہ بتانا صدقہ ہے صلح کرانا صدقہ ہے مسلمان سے خندہ روئی سے پیش آنا صدقہ ہے مدعا یہ کہ مال وقت اور قوت میں سے جو کچھ بھی "العفو" کی تعریف میں آ جائے، اس میں سے جو رمق بھی خدا کی خوشنودی کے لئے بندوں کی خدمت میں صرف ہو جائے گی وہ صدقہ ہو گی ـــ اور صدقہ اسی وسیع تصور کے ساتھ ہر مسلمان کے لئے لازم کیا گیا ہے

صدقہ کی وسعت کا تصور دلانے کے لئے ایک اور حدیث کا حوالہ ضروری معلوم ہوتا ہے جسے ترمذی کے علاوہ صحاح ستہ کی ساری کتابوں میں لیا گیا ہے روایت یوں ہے کہ ایک اعرابی نے آنحضرت صلعم سے

معاشیات میں رہنما ہوتے ہیں، کسی روپ میں ان کو گوارا کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ اسلامی معاشیات کے منصوص اور فقہی قوانین کی فہرست پیش کی جائے بلکہ مجھے صرف یہ تصور دلانا ہے کہ کن معاشی مفسدات کو روکنے کے لئے اسلام نے قوانین کے شکنجے کھڑے کئے ہیں۔ اسلام کے معاشی قوانین اپنے مقاصد کے لحاظ سے جن قسموں میں بانٹے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین قسمیں یہ ہیں:

(۱) وہ قوانین جو دوسروں کے حق ملکیت میں دخل اندازی کرنے سے روکنے کے لئے ہیں۔

(۲) وہ قوانین جو دولت عامہ پر کسی اجارہ داری اور شخصی ملکیت کے قیام میں مانع ہیں۔

(۳) وہ قوانین جو سوسائٹی کو اخلاقی نقصان پہنچا کر نفع اندوزی کرنے سے باز رکھنے والے ہیں۔

(۴) وہ قوانین جو دولت کو تعیشات میں صرف کرنے سے روکنے کے لئے ہیں۔

(۵) وہ قوانین جو معاشرہ کی حقیقی خدمت کے بغیر زراندوزی کرنے سے روکتے ہیں۔

(۶) وہ قوانین جو ایسے معاملات کی روک تھام کرتے ہیں جن سے جھگڑے پیدا ہوں یا جن میں اصولاً ایک فریق کے نقصان پر دوسرے فریق کے نفع کا دارومدار ہو۔

(۷) وہ قوانین جو کاروباری معاملات کو فریب دہی سے پاک کرنے کے لئے ہیں۔

(۸) وہ قوانین جو لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی صورتوں کی روک تھام کے لئے ہیں۔

(۹) وہ قوانین جو سوسائٹی کی مالی ضروریات کا بار مالدار کے کندھوں پر ڈالتے ہیں۔

(۱۰) وہ قوانین جو دولت اور ذرائع و وسائل کو ایک جگہ سمٹنے سے روکنے اور ان کو پھیلانے اور گردش دینے کے لئے مخصوص ہیں۔

اسلام کا یہ متوازن قانونی نظام صرف اسی صورت میں تعمیر ہوکر کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے جبکہ اس کی تہائی صحیح اعتقادی اور اخلاقی بنیادوں پر ایک صالح تعمیر ہو۔ ایسے اندر اسلام کے معاشیاتی قوانین ٹھیک وہ کام کرتے ہیں جو کسی مضبوط قلعہ کی برجیوں میں بیٹھے ہوئے دیدبان اور سنتری کرتے ہیں۔ اگر یہ قلعہ جا بجا سے خستہ ہو اور اس کی دیواروں میں بڑے بڑے رخنے موجود ہوں اور اس کے کواڑ اپنی جگہ چھوڑ چکے ہوں

توجب تک اس کی تعمیر جدید کا سامان نہ کیا جائے، محض برجیوں پر بیٹھے ہوئے دیدبان اور سنتری معاشی مفاسد کے لشکروں کو اندر داخل ہونے سے نہیں روک سکتے۔ اسلام کے معاشیاتی ضوابط اتنے وسیع اور دور رس ہیں کہ انہیں اگر ایک صالح معاشرہ میں نافذ کیا جائے تو کوئی ایسا چور دروازہ کھلا ہی نہیں رہتا جس سے سرمایہ داری کا شیطان گھس سکے۔ اور ان قوانین کی روح اگر محفوظ رہے تو ناممکن ہے کہ مسلم سوسائٹی کے اندر معاشی ناہمواریاں رونما ہو کر حدت ملی کو پارہ پارہ کریں۔ اس قانونی نظام کے اندر یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص اچھی صاف ستھری زندگی بسر کرنے کے لئے اللہ کے خزانۂ رزق میں سے کوئی بڑا حصہ پالے لیکن ایسا ممکن نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے ان کے حصوں کے وظائف رزق چھینتا ہوا، اور ان کی حق ماریاں کرتا ہوا سیم و زر کے خارونی انبار جمع کر سکے۔

(۲)

اب تک میں نے اسلام کی معاشی اسکیم کو علمی زاویۂ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی معاشروں کو معاشی ناہمواریوں سے بچانے کے لئے اسلام ایک مفصل منصوبہ K Plan اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ ایک خاص ذہنیت بناتا ہے۔ ایک خاص طرز کا اخلاق سکھاتا ہے۔ ایک خاص نہج پر سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے۔ اور پھر ایک خاص قانونی نظام برپا کرتا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں۔ کہ اسلام کی جو اسکیم میں نے بیان کی ہے اس کی روشنی میں آپ کو پاکستان کے مختلف معاشی مسائل کے عملی حل کا تصور بھی دلا دوں تاکہ آپ اسلامی نظام کی فوقیت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے مقابلے میں اس کی قدر و قیمت متعین کر سکیں۔

میں اپنی تقریر کے اس دوسرے حصے میں یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ قرار دادِ مقاصد کے تقاضوں کے مطابق اب اگر پاکستان کا چارج عملاً اسلام کو مل جائے تو وہ ہمارے ہاں کی معاشی ناہمواریوں کے ختم کرنے کے لئے اپنے خاص اصولوں کے تحت کیا عملی تدابیر اختیار کرے گا۔ اور یہ کہ اسلامی نظام کا نام لینے والوں کی ذمہ داریاں اس بارے میں کیا ہیں؟

چند کاروباری مفاسد کا سد باب ہم آج جن معاشی ناہمواریوں سے دوچار ہیں ان کے پیدا کرنے والے

مختلف وجوہ میں وہ بڑے بڑے کاروباری مفاسد بھی شامل ہیں جو آج کی مارکیٹ کی رگ رگ میں خون بن کر گردش کر رہے ہیں۔ جب تک ان زہریلے عناصر سے کاروبار کے عروق و اعصاب کو پاک نہ کر لیا جائے، ہم معاشی ناہمواریوں کی اصلاح پر کبھی قادر نہیں ہو سکتے۔

ان کاروباری مفاسد میں اولین اہمیت سود کی ہے۔ ہمارا نظام معیشت سودی نظام معیشت ہے اور سود کا وجود اسلام کی عین نفی ہے۔ سود کو اسلام نے اعتقادی، اخلاقی اور قانونی ہر لحاظ سے حرام ٹھہرایا ہے۔ اور پھر سود کی حرمت کی نوعیت ایسی شدید بتائی ہے کہ ایک مسلمان سوسائٹی کے لیے سودی نظام معیشت کا جاری رہنا ناقابل برداشت عذاب ثابت ہونا چاہیے۔ قرآن نے سود خواروں کو "فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ" کا پیغام سنایا یعنی خدا اور رسول کی طرف سے سود کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا۔ پھر سود خواری ہی نہیں بلکہ سودی معاملات کی دستاویزات لکھنے اور حسابات رکھنے کو بھی قابل مؤاخذہ جرم قرار دیا گیا۔ دوسری طرف حدیث نبوی نے سود کے جرم کا بھاری پن اور اس کے اثرات بد کی وسعت کو واضح کرنے کے لیے یہ حقیقت بیان کی کہ سود خواری کا گناہ ستر مرتبہ کی زنا کاری سے بھی زیادہ شدید ہے۔ حرمت ربوا کی اس نوعیت کو معلوم کر لینے کے بعد ہی صلعم کے صحابہ نے اپنے آپ کو نہ صرف ربوا سے پوری طرح بچایا ہے بلکہ ایسے معاملات جو صریحاً سودی معاملات نہیں لیکن ان میں ربوا کا رنگ یا شائبہ پایا جائے یعنی سودی معاملات سے مشابہت ہوتی ہو ان سے بھی پوری طرح اجتناب کیا۔

سود کی حرمت کی اس شدت کے محسوس کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ سود کی قسم بندیاں کرے۔ اور پھر اس بات کی تقیہی گنجائشیں ڈھونڈے کہ فلاں قسم کا سود اگر حرام ہے تو فلاں قسم کا سود کمانے میں شریعت مانع نہیں ہے۔ لیکن تحفظ پذیر ذہنوں نے یہ بھی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ شخصی سود خواری تو حرام ہے لیکن بنکوں کے سود کو اسلام کیسے حرام قرار دے سکتا ہے جو کاروبار کی ترقی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور جو درحقیقت سود نہیں بلکہ منافع تقسیم کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں نہ صرف یہ کہ اسلام کو نہ سمجھنے کی دلیل ہیں بلکہ جدید معاشیات اور دور حاضر کے بنکنگ سسٹم کو نہ سمجھنے کی گواہی بھی دیتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بنک کے سود کی ماہیت پر چند باتیں عرض کر دوں۔

بنکوں کا سود بنک کے سود میں ٹھیک وہی خباثتیں پائی جاتی ہیں جو شخصی سودی معاملات میں ہوتی ہیں۔ اس کا ظاہر بدل جاتا ہے، باطن نہیں بدلتا۔ بنک کے سود کی حقیقت یہ ہے کہ بنک جن لوگوں کے سرمائے سے چلتے ہیں وہ اپنے لاکھوں اور کروڑوں روپے بنک کے کاروبار میں اس معاہدے پر لگاتے ہیں کہ ان کو بہر حال اپنی رقم کے حساب سے فیصد منافع لازماً ادا کر دیا جائے، چاہے بنک کو نفع ہو یا نقصان، یا نفع ہو تو کم نفع ہو یا زیادہ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ بنک اپنے دفاتر اور خزائن کے اندر سے تو منافع نکال کر سرمایہ داروں کو دے نہیں سکتا اور نہ ان کے جمع کردہ روپے میں نسل کشی کی استعداد موجود ہے۔ بنک بہر حال ایک طرف سے لے کر ہی دوسری طرف دے سکتا ہے۔ چنانچہ کوئی بنک جب اپنا سرمایہ بڑے بڑے کاروباری اداروں اور صنعتی کارخانوں میں لگاتا ہے تو وہ بھی اسی اصول پر شرح منافع پہلے سے طے کر لیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرز پر کاروباری ادارے اور صنعتی کارخانے اپنی مصنوعات اور مال تجارت کی قیمتوں میں سود کی وہ رقم شامل کر دیتے ہیں جو بنکوں کی طرف سے ان کے ذمے آتی ہے۔ یہاں تک کہ سود کی بلا آخر کار ضروریات زندگی کے اس آخری عام گاہک کی جیب پر آ پڑتی ہے جو اس کو کسی دوسرے پر پھینک نہیں سکتا۔ یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ایک ملک کے بنک کئی کروڑ روپیہ سالانہ کی جو رقم منافع کے نام سے اپنے حصہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں، وہ اس ملک کے غربا اور عوام ہی کی جیبوں سے غیر محسوس طریق سے نکل کے آتی ہے۔ ایک سودی نظام معیشت کے تحت آپ بازار میں جا کر اگر ایک آنے کی شکر یا تین پیسے کی دیا سلائی بھی خریدتے ہیں تو اس ایک آنے اور تین پیسے میں بھی سرمایہ داروں کا وہ چندہ شامل ہوتا ہے جسے بنک منافع کے نام سے تقسیم کرتے ہیں۔ جس سوسائٹی میں بنکوں کا سود جائز قرار دیا گیا ہو اس میں کسی متقی ترین فرد کے لئے بھی یہ ممکن نہیں رہتا کہ اپنے دامن کو سود کے داغ سے پاک رکھ سکے۔ حرام کا یہ ہمہ گیر زہر حلال اور پاک اشیا میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ سودی نظام میں قدرتی طور پر اشیاء کی قیمتوں کے ساتھ سود کا بار شامل ہو کر ان کو بوجھل بنائے رکھتا ہے، دوسری طرف ربائی معیشت ملک کے چند مالدار افراد کے پاس ملک کی دولت کو ہر طرف سے سمیٹ سمیٹ کر لے آتی ہے اور اس کا نتیجہ خطرناک ناہمواریوں کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔

پس اسلام کے منشا کے مطابق اگر معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنا ہو تو پھر سوسائٹی کو سود سے پاک کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ سود اگر کتاب و سنت کی رو سے حرام ہے تو اسے پاکستان کی اسلامی ریاست میں قانونی

بت بھی حرام بھی ہونا چاہئے۔

سُود کی حرمت کو عملی جامہ پہنانے کا ذکر آتے ہی یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ اگر سُود کو قطعی طور پر ممنوع ٹھہرا دیا جائے تو بنکنگ سسٹم کا سرے سے خاتمہ ہو جائیگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بنکوں کے بغیر آج نہ تجارت چل سکتی ہے۔ اور نہ حکومت کے مالیات کا نظام ہی برقرار رہ سکتا ہے۔

یہ سوال یقیناً ایک وزنی سوال ہے۔ اور آپ کے سامنے جو لوگ سُود کی حرمت کا پیغام لا رہے ہیں۔ وہ اس سوال کی اہمیت سے غافل نہیں ہیں لیکن وہ اس کو لاینحل نہیں سمجھتے ــــ اور در حقیقت دنیا میں کوئی سوال لاینحل نہیں ہے بشرطیکہ کسی قوم اور حکومت میں اس کے حل کرنے کا سچا عزم موجود ہو۔ ایک ایسا گروہ جو اپنے اصولوں کا محض پاسباں ہوتا ہے وہ ان کو قائم کرنے کے لئے سو راہیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اپنی دنیا آپ بنانے کا ولولہ موجود ہو اور خودی اتنی زندہ ہو کہ دوسروں کے در پر اصول و افکار کی گداگری کی ذلت کو گوارا نہ کر سکے۔ اوصاف اگر کسی گروہ میں نہیں ہیں۔ تو اس کے لئے اس آسمان کے نیچے حقیقی آزادی نہ پہلے کبھی تھی اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔

اسلامی نظام معیشت آپ کو ایک نئے بنکنگ سسٹم کے قائم کرنے کے لئے سُود کے اصول کے بجائے مضاربت کا اصول مہیا کرتا ہے۔ اصول مضاربت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طرف کا سرمایہ اور دوسری طرف کی محنت باہم متعاون ہو کر کام کریں اور نتائج میں کسی طے شدہ تناسب کے مطابق دونوں شریک ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اصول مضاربت کے معنی "حصہ داری نفع و نقصان"[1] کے ہیں۔ اس اصول پر اگر بنکوں کو سرمایہ دیا جائے۔ اور اسی

[1] ایک صاحب نے مجھ سے کراچی میں یہ سوال کیا تھا کہ سرمائے پر سُود دیا جائے یا منافع دونوں صورتوں میں واقعہ کی حقیقت میں تو کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ سو جس طرح سُود کا بار اشیاء کی قیمتوں پر پڑتا ہے۔ اسی طرح منافع کا بار بھی تو پڑیگا۔ پھر فرق کیا ہوا؟

اس کے جواب میں میں نے ان کی خدمت میں یہ عرض کیا تھا کہ سود کی مقدار چونکہ پہلے سے طے ہوتی ہے اس لئے وہ مصنوعات کے مصارف تیاری (Cost of Production) میں شامل کر دی جاتی ہے لیکن حصہ داری منافع کے اصول پر جو سرمایہ صنعت میں لگایا گیا ہو۔ اس کا منافع پہلے سے معلوم نہیں ہوتی اسلئے اشیاء کے مصارف تیاری میں استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ برعکس اس کے مارکیٹ ریٹ کے رُو سے جب کسی سرمائے پر منافع یا نقصان نمودار ہو چکتا ہے تب اس کی تقسیم ہوتی ہے۔ دوسرا فرق اصول سود اور اصول مضاربت میں یہ ہے کہ اول الذکر اصول کے تحت سرمایہ دار نفع تو لیتا ہے لیکن نقصان سے صاف بچ کے نکل جاتا ہے لیکن دوسرے اصول کے تحت اگر وہ نفع لینے جاتا ہے تو اسے نقصان کا بار بھی بہرحال اٹھانا پڑتا ہے [illegible]

سوال کیا۔ کہ مجھے ہجرت کا مسئلہ بتائیے۔ آپ نے فرمایا تیرا بھلا ہو وہ بہت دشوار کام ہے یہ بتا کہ تیرے پاس کوئی اونٹ ہے؟ اعرابی نے عرض کیا جی ہاں اونٹ تو ہیں فرمایا کیا تو ان میں سے صدقہ زکوۃ دیتا ہے؟ اس نے عرض کیا جی دیتا ہوں۔ پھر پوچھا۔ کیا ان میں سے دودھ پینے کیلئے کسی کو عاریتہً کوئی اونٹنی کبھی دیتے ہو؟ وہ بولا جی ہاں دیتا ہوں پھر دریافت فرمایا کہ کیا گھاٹ پر جانیکے دن مسکینوں کو دودھ بانٹتا ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا یہی طرزِ عمل جاری رکھ۔ خدا تعالیٰ تیرے عمل صالح میں سے کوئی چیز ضائع نہ ہونے دے گا۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے۔ کہ صرف صدقہ زکوۃ کی ادائگی ہی کا مطالبہ نہیں بلکہ اپنی اموال اور ذرائع و وسائل کے ذریعے ہر طرح کی خدمات عامہ انجام دیتے رہنا مطلوب ہے۔ جس نبیؐ نے امت سے یہ چاہا کہ:

لَا تَمْنَعُوْا فَضْلَ الْمَآءِ لِتَمْنَعُوْا بِهِ الْكَلَأَ۔	زائد پانی کو نہ روکو، کیونکہ اس طرح تم نباتات کی روئیدگی کو روکتے ہو۔

وہ کیسے پسند کرسکتا ہے۔ کہ دولت ذرائع و وسائل اور قوائے کارکردگی میں "العفو" کو روک کر رکھا جائے۔ اور اس طرح آدمی سوسائٹی کی ضروریات کے پورا ہونے میں رکاوٹ پیدا کرے۔

ماعون دینا صدقہ کی ایک قسم گھریلو استعمال کے آلات مثلاً ترازو، باٹ، چھلنی، چھاج، کلہاڑی، کدال وغیرہ کو مستعار دینا ہے۔ انہی چیزوں کو ماعون کہا گیا ہے۔ اور ان کے بارے میں بخل کرنیکو سورۂ ماعون میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

اسلامی اخلاقیات اور سرمایہ داری اب آپ خود غور کیجئے۔ کہ اگر کسی آبادی کے اکثر افراد میں اسلامی اخلاق پایا جاتا ہو کہ وہ دولت پرستی کے بجائے ایک، اونچے اخلاقی نصب العین کیلئے ہمہ تن وقف ہوں۔ انکی نگاہیں رزق کفاف پر مرتکز ہوں، وہ دونوں ہاتھوں سے انفاق کرتے ہوں، وہ "العفو" کو دوسروں کی اجتماعی اور انفرادی ضروریات میں صرف کرتے ہوں، وہ باہم "ماعون" دیتے ہوں، وہ کاروبار پر اخلاقی حدود کے پابند ہوں تو یہ بات کس طرح ممکن ہے۔ کہ ان میں سرمایہ داری فروغ پائے؟

کہا جاسکتا ہے کہ یہ اسلامی اخلاقیات آج کہاں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ جب اسلامی سوسائٹی کا نظم ہی کئی صدیوں سے درہم برہم چلا آرہا ہے۔ اور سرے سے عقاید اور عبادت اساسی ہی برقرار نہیں رہے

تو ان عقاید و عبادات پر استوار ہونے والے اخلاقیات کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جو سیلاب پورے اسلامی نظام کو بہالے گیا ہے، اس کی رو میں اسلام کے اخلاقی تقاضوں کو بھی بہالے گئی ہیں۔ پس آج اگر عقائد و عبادات کو بحال کرنے کے لئے کوئی مہم شروع کی جانی چاہئے۔ تو یقیناً اسلام کے ان اخلاقی تقاضوں کو قائم کرنے کے لئے بھی ایک منظم جدوجہد ہونی چاہئے۔ بالیکن پھر اس پر کہا جاتا ہے کہ اس اخلاق کے افسانے تو کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کو قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ مایوسی کا یہ رجحان اسلام کے ہوشیار مخالفین نے پیدا کیا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر حکومت اور سوسائٹی جمہوریت کے نظام کا مطلوبہ اخلاق پیدا کرنے کے پروگرام بنا سکتی ہے۔ اگر تعلیم اور نشر و اشاعت کے ذرائع مادہ پرستانہ اخلاقیات کو فروغ دے سکتے ہیں۔ تو خاص اسلام ہی کے اخلاقیات کی بحالی کے لئے وہ کیوں بیکار ہیں؛ یا تو یہ کہئے کہ کسی طرز کا اخلاق بھی تبلیغ و تعلیم اور تربیت کے ذریعے انسانوں میں پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور یا پھر تسلیم کیجئے کہ اگر کوئی غیر اسلامی اخلاق پیدا کیا جا سکتا ہے تو اسلامی اخلاق بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسلام کے لئے یک طرفہ مایوسی کیوں؟ جس اخلاق کو اسلام عرب کے ان پڑھ بدوؤں میں پیدا کر کے دکھا چکا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اسے وہ آج کے ذہین اور تعلیم یافتہ انسانوں میں پیدا نہ کر سکے جب کہ آج اسے اعلیٰ سے اعلیٰ ذرائع و وسائل میسر آ سکتے ہیں۔

ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ایک صالح قیادت بر سر عمل ہو اور وہ حکومت کی زمام کار ہاتھ میں لینے کے بعد اس کی ساری قوتوں کو رضائے الٰہی کے مطابق استعمال کرنے کا آغاز کر دے۔

۳۔ صالح معاشرہ کی تشکیل

اسلام افراد میں اخلاق کی تعمیر کرنے کے بعد ان کو حالت انتشار میں نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ وہ ان اینٹوں کو جوڑ کر معاشرہ کا ایک ایسا قلعہ تعمیر کرتا ہے جس میں کسی معاشی فساد کے لئے داخل ہونا آسان نہ ہو۔ اور جس کی فضا میں معاشی امن پوری طرح نشو و نما پا سکے۔ انفرادی اخلاق یقیناً ایک قابل قدر نعمت ہے، لیکن اگر اس اخلاق کے تقاضوں کے مطابق معاشرہ کا ماحول تشکیل نہ پائے۔ تو انفرادی اخلاق آہستہ آہستہ سوکھ جاتا ہے۔ اسلامی نظام حیات کے تحت جہاں افراد میں ایک خاص طرز کی سیرت پیدا کی جاتی ہے۔ وہاں اسی سیرت کے مطابق ایک صالح سوسائٹی بھی وجود میں لائی جاتی ہے جس سوسائٹی کی فضا میں افراد کی سیرت کے جوہر پوری طرح کھلتے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے کھلتے ہیں جس

تناسب سے کہ معاشرہ کی اجتماعی فضا کو اسلام کے منشا پر ڈھالا گیا ہو۔

معاشی نقطۂ نظر سے اسلام اپنے اصولوں پر تعمیر کئے ہوئے معاشرے میں افراد کے درمیان ایسی وابستگی اور قرابت داری چاہتا ہے، کہ جس کے زیر اثر وہ ایک دوسرے سے تعاون کرنے والے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام معاشیات کے تحت ہر فرد انسانی دوسروں سے کچھ کما لینے کو اپنا کمال سمجھتا ہے۔ اور اپنی کمائی میں اپنی خواہشات کے حقوق کے سوا دوسروں کے حقوق کا احساس نہیں رکھتا بخلاف اس کے اسلام اپنے معاشرہ میں یہ چاہتا ہے کہ دوسروں سے کمایا ہی نہ جائے، بلکہ دوسروں پر خرچ بھی کیا جائے، دوسروں سے نفع اٹھایا ہی نہ جائے، انہیں نفع پہنچایا بھی جائے، نیز اسلام اپنی سوسائٹی کے ہر فرد کو دوسرے افراد کے گوناگوں حقوق کا احساس دلاتا ہے ایک مسلم اپنی ضروریات نفس ہی کا ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے ساتھ مختلف قسم کے تعلقات رکھنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے متعلق بھی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے۔

یہ احساس حقوق اور شعور ذمہ داری جو اسلام اپنے معاشرہ کے ہر فرد میں بیدار کر دینا چاہتا ہے۔ اس کے ذریعے تعاون و اخوت کی ایسی فضا تشکیل پاتی ہے جس میں طبقاتی تقسیم اور طبقاتی انتفاع اور طبقاتی تصادم کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں۔

یہاں اُن حقوق کی چند اصولی اقسام بیان کی جاتی ہیں۔ جو اسلامی معاشرہ کے تحت ہر فرد مسلم کے پیش نظر رہتے ہیں۔

حقوق نفس حقوق کی تقسیم کا سوال جونہی چھیڑا جائے سب سے پہلے ایک فرد کی اپنی ہستی سامنے آتی ہے چنانچہ نبی صلعم فرماتے ہیں۔ کہ "ولنفسک علیک حق"[1] یعنی آدمی کے اوپر خود اپنے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ان حقوق سے اسلام نے رہبانیت کی طرح روگردانی نہیں کی۔ بلکہ ان کو تسلیم کیا ہے۔ اور ان کے لئے اپنے نظام فکر و عمل میں باقاعدہ جگہ نکالی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ جب تک انسان اپنے نفس کے حقوق کا نٹے کے تول پورے کر کے ادا نہیں کرتا، وہ دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں ہمیشہ افراط و تفریط سے کام لیتا رہتا ہے۔

ایک فرد مسلم کو بہر حال اپنی کمائی کے بل پر شرعاً ایک صاف ستھری زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سے یہ مانگا گیا ہے کہ وہ محنت کے مطابق اپنے نفس کو آرام بھی پہنچائے۔ وہ صفائی ستھرائی سلیقہ و ذوق کا تمام

[1] مشکوۃ میں ہے:- ولنفسک علیک حق

بھی کرے وہ اپنی بود و باش ایسی رکھے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کا شکر آمیز اظہار ہو لیکن دو مفاسد سے پرہیز لازم ہے۔ ایک یہ کہ نفس کے تقاضوں کو اسراف کی حد تک نہ پہنچنے دے دوسرے یہ کہ نفس کو کبر کے مظاہرے کا حق نہ دے ورنہ یہ دونوں مفاسد اس کی سیرت کو اسلام کی بنیادوں سے ہٹا کر رہیں گے اور ان کا نتیجہ آخرت میں بہرحال دوزخ ہے۔

حقوقِ والدین فردِ مسلم کے لئے اپنے نفس سے باہر کی دنیا میں اسلام نے حقوق کا سب سے زیادہ بڑا بوجھ اگر کسی کا بتایا ہے تو وہ والدین کے حقوق کا بوجھ ہے سوال ادب و اطاعت ہی کے انتہائی اہتمام کا نہیں، بلکہ معاشی طور پر بھی والدین کی پوری پوری خدمت انجام دینے کی ذمہ داری اولاد پر عائد ہوتی ہے، دنیا کا یہ اہم ترین رشتہ ہے جس کے حقوق کو پہچاننے سے انسانی زندگی کے سارے حقوق کا شعور ہوتا ہے باپ کی شفقت اور ماں کی محبت کی قدر اگر کسی کے دل میں پیدا نہ ہو سکے تو پھر نہ وہ خدا تعالیٰ کی بخششوں کا قدر دان ہو سکتا ہے نہ دوسرے ابنائے نوع کے حقوق کا اسے کوئی احساس ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے حقوق کے بعد مخلوق میں سے اسلام نے والدین کے حق کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے معاشی نقطۂ نظر سے اسلام نے اخلاقی حد تک ہی نہیں بلکہ قانونی طور پر بھی والدین کو اولاد اور اس کے سارے اموال و املاک کا مالک ٹھہرایا ہے اور انہیں حق دیا ہے کہ اولاد کے اموال میں جو تصرف چاہیں کر لیں!

حقوقِ اہل و عیال حقوقِ والدین کے بعد دوسرا درجہ اہل و عیال کے حقوق کا ہے بیوی بچوں کا نان و نفقہ یعنی ان کی معاشی ضروریات کا پورا کرنا اسلام کے قانون کی رو سے واجب ہی ہے لیکن اگر یہ حق خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے اور اس کی ہدایت کے مطابق ادا کیا جائے تو ہر وہ کوڑی عنداللہ صدقہ شمار ہوتی ہے جو کسی شخص نے اپنے اہل و عیال پر خرچ کی ہو اپنے اہل و عیال کی جائز ضروریات پوری کرنے کیلئے جائز ذرائع سے جو کوشش کی جائے وہ قطعی طور پر عبادت کی تعریف میں داخل ہے پھر اسلام نے اپنی روح مساوات کو قائم رکھنے کے لئے یہ چاہا ہے کہ ایک مسلم اپنے اہل و عیال پر اپنی آمدنی کے مطابق صرف کرے اور بیوی بچوں کو وہی کچھ کھلائے اور پہنائے جو کچھ کہ وہ کھاتا پہنتا ہے اس سے بھی آگے بڑھ کر سفارش یہاں تک کی گئی ہے کہ ایک آدمی اپنے متعدد بچوں پر مال صرف کرنے میں تفریق نہ کرے ورنہ ان میں اخلاقی مفاسد پیدا ہونگے۔

حقوق اہل وعیال کے بارے میں احادیث سے یہاں تک اشارات ملتے ہیں کہ اپنے زیر کفالت افراد کی حقیقی ضروریات کو نظر انداز کر کے جو انفاق باہر کیا جاتا ہے اس میں اہل وعیال کی حق ماری پائی جاتی ہے چنانچہ نبی صلعم نے متعدد مواقع پر اپنے زیر تربیت صحابیوں کو یہ تلقین فرمائی کہ جاؤ اور اپنے اہل وعیال پر مال صرف کرو تمہارے لئے صدقہ یہی ہے اور تمہارے انفاق کے اولیں مستحق تمہارے بیوی بچے ہیں بیوی بچوں کو خستہ حال چھوڑ کر اگر کوئی شخص روپیہ جمع کرتا ہے یا اپنی ذاتی عیاشیوں پر بے تحاشا اپنی کمائی صرف کرتا ہے اور اپنی خوش پوشی اور خوش حالی کا مظاہرہ کرتا پھرتا ہے. یا گھر والوں کو بھوکا چھوڑ کر باہر داد و دہش کر رہا ہے تو اس کی روش اسلام کے تقاضوں کے مطابق بہر حال نہیں ہے۔

<u>حقوق ذوی القربیٰ</u> والدین اور اہل وعیال کے بعد قرآن اور حدیث دونوں میں ذوالقربیٰ کے حقوق کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ ایک مسلم ان سے چشم پوشی کر کے اپنی عاقبت کے متعلق کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا قرابت داروں کا شرعی حق ہے کہ ایک طرف مسلمان ان کے ایمان و اخلاق کے نشو ونما کے لئے جو کچھ کر سکتا ہو کرے اور دوسری طرف وہ معاشی پہلو سے جس حد تک امداد کے محتاج ہوں۔ ان کو امداد بہم پہنچائے ۔

نبی صلعم کے لیے خمس دینے کا جو حصہ اسلامی سٹیٹ کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا اس کے ساتھ آپ کے ذوی القربیٰ کا حق بھی شامل کیا تھا چنانچہ نبی صلعم نے اس حق کو عمر بھر اس طرح ادا کیا کہ بالفاظ کتاب الخراج آنحضور اسی مال سے بنو ہاشم کے کنواروں کی شادیاں کرتے تھے ، مقروضوں کے قرض ادا کرتے تھے۔ اور فقرا کو بقدر ضرورت عطا کرتے تھے ۔ آپ کے اسوہ کے مطابق آپ کے ہر امتی کے لئے لازم ہے. کہ اس کی آمدنی جہاں تک کفایت کرے ، اپنے رشتہ داروں کی معاشی ضروریات میں ان کا معاون بنتا ہو۔

اگر کسی سوسائٹی میں حقوق ذوی القربیٰ کا احترام پایا جاتا ہو تو ظاہر ہے کہ ایک ضرورتمند شخص کو اپنے رشتہ داروں کے وسیع حلقے میں سے کسی نہ کسی طرف سے مشکل وقت میں امداد بہم پہنچ سکتی ہے ۔

<u>حق الجار</u> ذوی القربیٰ کے بعد پڑوسی کے حقوق پر زور دیا گیا ہے انجیل میں دین کے تصور کو ان الفاظ میں سمیٹا گیا ہے کہ تو اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور ساری جان کے ساتھ محبت رکھ اور اپنے پڑوسی

کی خدمت کرو" یہ جملہ حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد کا جو تصور دلاتا ہے اس میں پڑوسی کے حق کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ احادیث میں ہر مسلمان سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کے جان و مال اور آبرو کا پورا پورا محافظ ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ترغیب دی گئی ہے کہ اگر گھر میں کوئی نعمت آئے تو اس کا ایک حصہ پڑوسی کے بچوں کے لئے بھی بھیجا جائے۔ سالن پکے تو پڑوسی کو ہدیہ کرنے کے لئے اس میں گنجائش رکھنی چاہئے۔ پھر ایک حدیث ہم کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ اس شخص کا ایمان مشتبہ ہے جس نے خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھایا لیکن اس کا پڑوسی فاقہ میں مبتلا رہا۔

پڑوس کا یہ معاشی حق اصلاً تو دیوار بہ دیوار کے ہمسایوں کے لئے مخصوص ہے لیکن اس سے محلے اور شہر اور ملک کے ضرورتمندوں کی خدمت کی ذمہ داری کا اشارہ از خود اخذ ہوتا ہے پھر پڑوس سکونت ہی کا نہیں کاروباری قرابت کا پڑوس بھی ہوتا ہے۔ ایک بازار کے دوکاندار ایک دفتر کے ملازم ایک کارخانے کے کارندے ایک گاؤں کے زمیندار اور دہقان باہم پڑوس کا حق بدرجہ اولیٰ رکھتے ہیں۔

یہ حق الجار جس کا شعور و احساس مر جانے کی وجہ سے سرمایہ داری کو نشوونما پانے میں سہولت حاصل ہو گئی ہے اس کو اگر تعمیرِ معاشرہ میں پوری طرح اہمیت دی جائے تو موجودہ ناہمواریوں پر کاری ضرب پڑ سکتی ہے۔

حقوق عامۃ المسلمین یہ تو خاص قسم کے حقوق ہیں جن کے تقاضے بہت وسیع ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں ایک عام مسلمان کے دوسرے مسلمانوں پر جو حقوق واجب کئے گئے ہیں۔ اگر صرف انہیں کو لے کے دیکھا جائے تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ان حقوق کے احترام کے ساتھ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے طور طریقے بحال رہ سکتے ہیں ایک مسلم کے دوسرے مسلمانوں پر کم سے کم یہ حقوق ہیں:-

(۱) اس کی جان، مال، آبرو کی حفاظت کی جائے (۲) وہ جب ملے اس پر سلام بھیج کر اس کی سلامتی کی دعا کی جائے (۳) اس سے برابر کا برتاؤ کیا جائے (۴) ہمیشہ اس کی بھلائی چاہی جائے (۵) اس کو معروف کی نصیحت کی جائے اور اسے منکر سے روکا جائے (۶) اسے چھینک آئے تو اس کے لئے خدا سے رحم کی دعا کی جائے (۷) وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کی جائے (۸) اس کے جنازے کے ساتھ متابعت کی جائے اور اس کے لئے مغفرت کی دعا کی جائے (۹) اس کے ہاں موت فوت ہو جائے تو تعزیت کی جائے (۱۰) اسے تحفہ اور ہدیہ دیا جائے (۱۱)

وہ دعوت دے، تو بخوشی قبول کی جائے (۱۲) وہ گھر آئے تو اسے برابر کی نشست پر بٹھایا جائے۔ (۱۳) وہ کھانے کے وقت حاضر ہو تو اسے دسترخوان پر دعوت دی جائے (۱۴) وہ مہمان یا مسافر ہو تو کم سے کم تین دن تک اس کی پوری تواضع کی جائے۔ (۱۵) وہ مشورہ طلب کرے تو اسے نیک مشورہ دیا جائے (۱۶) وہ سائل بن کر آئے تو اس کی ضرورت پوری کردی جائے، ورنہ نرمی سے معذرت کی جائے (۱۷) وہ قرض کا طالب ہو تو اسے قرض حسنہ دیا جائے (۱۸) وہ کسی چیز کا سودا کر رہا ہو تو اس میں مداخلت نہ کی جائے (۱۹) وہ کسی عورت کو نکاح کا پیغام بھیجے تو اس کے مقابلے پر نکاح کا پیغام نہ بھیجا جائے (۲۰) اس کے خلاف بدگمانی نہ کی جائے بلکہ حسن ظن سے کام لیا جائے (۲۱) اس کی غیبت نہ کی جائے۔ (۲۲) جہاں تک ہو سکے اس کی غلطیوں کو معاف کیا جائے (۲۳) وہ ظالم ہو تو اسے ظلم سے روکا جائے اور مظلوم ہو تو اسے ظلم سے بچایا جائے۔ (۲۴) وہ کسی سے رنجیدہ ہو تو مصالحت کرا دی جائے (۲۵) اس سے تین روز سے زائد مدت تک قطع تعلق نہ کیا جائے، وغیرہ!

ان سارے حقوق کو سامنے رکھ کر سوچیے اور فیصلہ کیجیے کہ یہ حقوق اگر کسی سوسائٹی میں ادا کیے جا رہے ہوں تو کیا اس کا امکان ہے کہ گروہ بندیاں اور طبقہ بندیاں پیدا ہوں اور ایک طرف سے اکڑ اور کبر کا رویہ پیش کیا جائے اور دوسری طرف سے بندگی اور غلامی کا مظاہرہ کرنے پر لوگ مجبور ہوں؟ یا کیا یہ ممکن ہے کہ کسی زیادتی کے کارن سے ناخوشگوار کیفیت نمودار ہو؟ ہماری موجودہ سوسائٹی تیزی سے سرمایہ دارانہ نظام کی طبقہ بندیوں کی طرف اسی لیے بڑھ رہی ہے کہ اس میں حقوقِ مسلم کا وہ احترام باقی نہیں رہا جو ایک نظامِ اخوت و مساوات پیدا کرتا ہے، اور معاشی ناہمواریوں کو ناقابلِ برداشت حالت تک پہنچنے نہیں دیتا۔ آج اگر ہمارے کارخانوں کے مالک اور زمیندار لوگوں میں ادائے فرض کا احساس بیدار ہو جائے اور وہ اپنے اجیروں کے سچے خیر اندیش، ان پر شفقت کرنے والے، ان کی مصیبتوں میں حصہ لینے والے، ان کی خبرگیری کرنے والے اور ان کو مساویانہ عزت کا حق دینے والے بن جائیں، تو موجودہ نظام کی معاشی ناہمواریوں کے اثرات بڑی حد تک ختم ہو سکتے ہیں۔ ہم سے کسان اور مزدور کی صرف اجرت ہی نہیں چھینی جا رہی بلکہ اس کے وہ مجلسی حقوق بھی مارے جا رہے ہیں جو اسلام نے اسے دیے تھے، اور اسی وجہ سے صورتِ حالات ناگوار ہو گئی ہے۔

فاقہ صرف روٹی ہی کا درپیش نہیں ہے بلکہ عزت و وقار کا فاقہ بھی درپیش ہے۔ اور ہمارے غربا صرف پیٹ ہی

کے بھوکے نہیں ہیں، بلکہ دل و دماغ اور روح کے بھی بھوکے ہیں، یہاں قحط صرف سکوں ہی کا درپیش نہیں ہے بلکہ اخوت و مساوات کے مظاہر کا بھی کال ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے۔ کہ یہ امرا اور غربا میں معاشی ہی نہیں مجلسی اور اخلاقی دوری بھی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نظام کے تقاضوں نے نماز کی اجتماعی صف بندیوں سے امرا کو بالکل الگ کر دیا ہے۔ زندگی کے کسی گوشے میں امیر اور غریب کا شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہونا ممکن نہیں رہا۔ دونوں طبقوں کی مجلسیں الگ ہو چکی ہیں، دونوں کی تہذیبیں الگ ہو چکی ہیں، دونوں کے محلے الگ ہو رہے ہیں، گاڑیوں میں دونوں کی نشستیں جدا جدا ہیں۔ اور قبرستانوں تک میں دونوں کی قبروں کا نقشہ ایک دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔ وہ "اخوت اسلامی" جس کے بارے میں نبی صلعم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان جتاتے ہوئے یہ کہا تھا، کہ اسلام کا یہ ایسا اعجاز ہے۔ کہ اگر تم اسے پیدا کرنے کے لئے دولت کے انبار بھی صرف کر دیتے تو کامیاب نہ ہو سکتے۔ اس کا پوری طرح تیا پانچہ ہو چکا ہے۔ اس اخوت کو بحال کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ دونوں طبقوں کی جداگانہ موجودہ بندیاں قائم کر کے معرکۂ پیکار گرم کیا جائے، بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ سوسائٹی کو "حقوق مسلم" کی بنیادوں پر دوبارہ استوار کیا جائے۔ حقوق مسلم کا اہتمام دونوں طبقات کے افراد کو از سر نو ایک صف میں لا کھڑا کرے گا۔

اسلامی سوسائٹی جس کے ایک ضرورت مند فرد کے بارے میں سب سے پہلے اس کے ذوی القربیٰ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہو، پھر اس کے پڑوسیوں کو اس کی خدمت کے لئے مامور کیا گیا ہو، پھر اسلامی جماعت کے ہر رکن سے اس کی اعانت کا مطالبہ کیا گیا ہو، کیسے ممکن ہے، کہ اس میں معاشی احتیاجیں موجود رہیں، اور کوئی ان کی خبر گیری نہ کرے۔

ایک مایوسانہ اعتراض کہا جائیگا۔ کہ ایسے صالح معاشرہ کا خواب کیسے تعبیر دکھا سکتا ہے۔ اور اس امر کی کیا ضمانت ہے۔ کہ امرا اپنے فرائض کو ادا کریں گے؟ اس کے جواب میں میں یہ عرض کروں گا کہ اسلامی سوسائٹی بنانے کے لئے اگر دس سال تک اس کے افراد میں اسلامی عقاید کی آبیاری کی جائے، اسلامی عبادات کو از سر نو قائم کر کے انہیں اسلام کے معاشی اخلاق کی تربیت دی جائے۔ پھر حکومت پورے وسائل کے ساتھ اہل عیال، ذوی القربیٰ، پڑوس اور عامۃ المسلمین کے حقوق کا احترام پیدا کرنے کی جد و جہد کرے، یہاں تک کہ ہمارے معاشرتی ماحول میں نئی روایات پیدا ہو جائیں، اور ایک رائے عامہ اسلام کے اخلاقی تقاضوں کی حفاظت کے

لئے بیدار ہو جائے۔ تو بہر حال یہ ناممکن ہے کہ موجودہ تفریق و تقسیم برقرار رہ سکے۔ اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے مطالبات کو پورا نہ کرنے والے خوش حال لوگوں کے خلاف جو صرف اپنی انفرادی لذات کے پیچھے پڑے رہیں، ایک جذبۂ نفرت کو بیدار کیا جائے۔ اور ایسے لوگوں کے لئے حکومت اور سوسائٹی کے مختلف میدانوں میں ترقی کرنے کے راستے بند کر دیئے جائیں۔ دولت معیار عزت نہ رہے۔ بلکہ فرض شناسی اور اخلاق معیار عزت ہو۔ سوال یہ ہے کہ جیسے آج ایک گالیاں بکنے والے، ایک نظر باز اور ایک فقرے کسنے والے کے لئے اگرچہ کوئی قانون فوجداری مزاحم نہیں ہے، لیکن بہر حال کسی مہذب سوسائٹی کے افراد ایسے لوگوں سے دوستی اور مجلس آرائی رکھنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کے پڑوس میں رہنے سے بچنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے اثرات سے اپنے بچوں کو بچانا چاہتے ہیں، اور کسی کار خیر کے لئے ان کو منتخب کرنے پر تیار نہیں ہوتے، اور اس طرح انسانیت کے ایک گھٹیا نمونے کو پنپنے سے روک سکتے ہیں، تو کیا وجہ ہے۔ کہ اسی طرح ہم اپنے ان امراء کے طرز عمل کو نشوونما پانے سے نہ روک دیں جو اسلامی سوسائٹی کے اعلیٰ اخلاقی مطالبات سے غافل ہو کر محض اپنی دولت میں مگن رہنا چاہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف نہ صرف رائے عامہ ایک تازیانے کا کام دیگی، بلکہ اسلامی نظام تعلیم خود آگے بچوں کو ان کے طرز عمل کے خلاف معرکہ آرا کر کے رہیگا۔ ایک سوسائٹی اگر اسلامی اخلاق کے تقاضوں کی حفاظت پر تُل جائے تو اسکی فضا میں اُن تقاضوں سے تغافل کرنے والوں کے لئے جینا محال ہو جاتا ہے۔ موجودہ نسل کے کچھ افراد اگر اپنی عادات بد کے بندھنوں سے پوری طرح آزاد نہ بھی ہو سکیں تو بھی بہر حال آئندہ نسل کو نئے نقشے پر تیار کیا جا سکتا ہے۔

خود دور نبوی میں ایسے منافقین موجود تھے جو اسلامی معاشرہ کے اخلاقی تقاضوں سے ہمیشہ انحراف کرتے تھے۔ باہم سازباز کرنا، خفیہ مشورے کرنا، اسلامی حکومت کی کارروائیوں کا مضحکہ اڑانا، اہم خبروں کو نشر کر دینا، دشمن کو مدد پہنچا دینا، مسلمانوں میں منافرت اور تعصبات پیدا کرتے رہنا۔ ان کے عام مشاغل تھے۔ ان مشاغل پر جنکے لئے کوئی قانونی کارروائی نہیں کی گئی بلکہ صرف صالح رائے عامہ کو ان کے استیصال کیلئے استعمال کیا گیا۔ چنانچہ ان کے لئے مسلم سوسائٹی میں کوئی عزت نہ تھی۔ اور نہ انہیں کبھی اجتماعی ذمہ داریوں اور خدمتوں کے لئے منتخب کیا گیا۔ ٹھیک اسی طرح اگر ہمارے سرمایہ دارانہ مزاج کے امراء اسی طرح اسلامی اخلاق کو قبول کر کے نہ دیں۔ تو ان کے لئے مسلم سوسائٹی میں عزت کا کوئی مقام نہ ہوگا

چاہے وہ کتنے ہی بڑے خزانوں کے سانپ بنے بیٹھے ہوں ۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ کوئی اصلاحی اسکیم محض قانون کے دباؤ سے کامیاب نہیں ہو سکتی، لہٰذا اسلام جو قانونی نظام نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے قیام اور نفاذ اور استحکام کے لئے بھی یہ ناگزیر ہے کہ اس کی فطرت کے مطابق ایک معاشرہ تعمیر ہو۔ اس معاشرہ میں بالعموم تو رضاکارانہ طور پر اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے کا رجحان موجود ہونا چاہئے۔ پھر جو چند سرکش افراد ان تقاضوں سے انحراف کرنا چاہیں۔ ان سے بالجبر دوسروں کے وہ کم سے کم حقوق وصول کر لئے جائیں۔ اور ان کم سے کم ذمہ داریوں کو پورا کرا لیا جائے جنہیں مسلم سوسائٹی کی فلاح اسلامی نظام اجتماعی کے استحکام اور امن و عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اسلام نے قانونی اہمیت دی ہے

۴۔ قانونی ممنوعات۔

قانون نہ افراد کی اصلاح کرتا ہے، نہ تعمیر معاشرہ کا فرض انجام دیتا ہے، بلکہ قانون کا کام صرف مفسدات کو حدود سے نکلنے کے بعد روک دینا، اور ان کے اثر سے دوسروں کو بچانا ہے۔ قانون کا عمل اثباتی نہیں۔ بلکہ منفی ہے۔ قانون کی حیثیت درحقیقت مطب کی دواؤں کی سی ہے کہ مرض اور اس کی علامات کا مقابلہ کرنے کے لئے ان سے مدد لی جاتی ہے لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ صحت و قوت کی تعمیر دواؤں سے ہوتی ہے۔ صحت و قوت کے لئے تو بہرحال غذا، صفائی، ورزش اور باقاعدگی وغیرہ اسباب سے کام لینا ناگزیر ہے۔ بالکل اسی طرح افراد کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح اور صالح معاشرہ کی تعمیر قانون سے نہیں بلکہ کسی نصب العین اور اصول و عقائد اور اخلاقی اقدار کے لئے مختلف ذرائع سے تعلیم اور تربیت دینے سے ہوتی ہے۔ قانون صرف اخلاقی فتنہ کے رونما ہو جانے پر اس کو روکنے کے لئے کام کرتا ہے پس مسئلہ سیاسی ہو یا معاشی بہرحال اس میں اصل اصلاح و تعمیر تو تعلیم و تربیت اور تزکیہ فکر و عمل سے ہوتی ہے، قانون صرف غیر اصلاح پذیر عناصر کو نشوونما پانے سے روکنے کا کام کرتا ہے۔ ٹھیک یہی مقام ہے جو اپنی معاشی اصلاح کی اسکیم میں اسلام نے قانون کو دیا ہے۔ اس کے ہاں ایسے قانونی ممنوعات جن کی حیثیت اصولی ہے، صرف گنتی کے پائے جاتے ہیں، لیکن ان ممنوعات کو وہ پوری سختی سے روکتا ہے۔ اور یہ جتنے مختلف روپ بدل کر

معاشیات میں جو رنما ہوتے ہیں، کسی روپ میں ان کو گوارا کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ اسلامی معاشیات کے منصوص اور فقہی قوانین کی فہرست پیش کی جائے۔ بلکہ مجھے صرف یہ تصور دلانا ہے کہ کن معاشی مفسدات کو روکنے کے لیے اسلام نے قوانین کے جنگلے کھڑے کئے ہیں۔ اسلام کے معاشی قوانین اپنے مقاصد کے لحاظ سے جن قسموں میں بانٹے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین قسمیں یہ ہیں:-

(۱) وہ قوانین جو دوسروں کے حق ملکیت میں دخل اندازی کرنے سے روکنے کے لئے ہیں۔

(۲) وہ قوانین جو دولت عامہ پر کسی اجارہ داری اور شخصی ملکیت کے قیام میں مانع ہیں۔

(۳) وہ قوانین جو سوسائٹی کو اخلاقی نقصان پہنچا کر نفع اندوزی کرنے سے باز رکھنے والے ہیں۔

(۴) وہ قوانین جو دولت کو تعیشات میں صرف کرنے سے روکنے کے لئے ہیں۔

(۵) وہ قوانین جو معاشرہ کی حقیقی خدمت کے بغیر زر اندوزی کرنے سے روکتے ہیں۔

(۶) وہ قوانین جو ایسے معاملات کی روک تھام کرتے ہیں جن سے جھگڑے پیدا ہوں یا جن میں اصولاً ایک فریق کے نقصان پر دوسرے فریق کے نفع کا دارومدار ہو۔

(۷) وہ قوانین جو کاروباری معاملات کو فریب دہی سے پاک کرنے کے لئے ہیں۔

(۸) وہ قوانین جو لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی صورتوں کی روک تھام کے لئے ہیں۔

(۹) وہ قوانین جو سوسائٹی کی مالی ضروریات کا بار مالدار کے کندھوں پر ڈالتے ہیں۔

(۱۰) وہ قوانین جو دولت اور ذرائع و وسائل کو ایک جگہ سمٹنے سے روکنے اور ان کو پھیلانے اور گردش دینے کے لئے مخصوص ہیں۔

اسلام کا یہ متوازن قانونی نظام صرف اسی صورت میں پوری کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے، جبکہ اس کی بنائی ہوئی اعتقادی اور اخلاقی بنیادوں پر ایک صالح تعمیر ہو۔ ایسے اندر اسلام کے معاشیاتی قوانین ٹھیک وہ کام کرتے ہیں جو کسی مضبوط قلعہ کی برجیوں میں بیٹھے ہوئے دیدبان اور سنتری کرتے ہیں۔ اگر یہ قلعہ جا بجا سے شکستہ ہو اور اس کی دیواروں میں بڑے بڑے رخنے موجود ہوں اور اس کے کواڑ اپنی جگہ چھوڑ چکے ہوں

تو جب تک اس کی تعمیر جدید کا سامان نہ کیا جائے محض برچھیوں پر بیٹھے ہوئے دیدبان اور سنتری معاشی مفاسد کے لشکروں کو اندر داخل ہونے سے نہیں روک سکتے۔ اسلام کے معاشیاتی ضوابط اتنے وسیع اور دور رس ہیں کہ انہیں اگر ایک صالح معاشرے میں نافذ کیا جائے تو کوئی ایسا چور دروازہ کھلا ہی نہیں رہتا جس سے سرمایہ داری کا شیطان گھس سکے، اور ان قوانین کی روح اگر محفوظ رہے تو ناممکن ہے کہ مسلم سوسائٹی کے اندر معاشی ناہمواریاں رونما ہو کر وحدت ملی کو پارہ پارہ کریں۔ اس قانونی نظام کے اندر یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص اچھی صاف ستھری زندگی بسر کرنے کے لئے اللہ کے خزانۂ رزق میں سے کوئی بڑا حصہ پائے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ دوسروں سے ان کے حصوں کے دانا دانا رزق چھینتا ہوا، اور ان کی حق ماریاں کرتا ہوا، بے حد و حساب تکاثری اسباب جمع کر سکے۔

(۲)

اب تک میں نے اسلام کی معاشی اسکیم کو علمی نقطۂ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی معاشرے کو معاشی ناہمواریوں سے بچانے کے لئے اسلام ایک مفصل منصوبہ Plan اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ ایک خاص ذہنیت بناتا ہے۔ ایک خاص طرز کا اخلاق سکھاتا ہے۔ ایک خاص طرز پر سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے۔ اور پھر ایک خاص قانونی نظام برپا کرتا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اسلام کی جو اسکیم میں نے بیان کی ہے اس کی روشنی میں آپ کو پاکستان کے مختلف معاشی مسائل کے عملی حل کا تصور بھی دلا دوں تاکہ آپ اسلامی نظام کی فوقیت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے مقابلے میں اس کی قدر و قیمت متعین کر سکیں۔

میں اپنی تقریر کے اس دوسرے حصے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرارداد مقاصد کے تقاضوں کے مطابق اب اگر پاکستان کا چارج اسلام کو دے دیا جائے تو وہ ہمارے ہاں کی معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے کے لئے اپنے خاص اصولوں کے تحت کیا کیا تدابیر اختیار کرے گا۔ اور یہ کہ اسلامی نظام کا نام لینے والوں کی ذمہ داریاں اس بارے میں کیا ہیں؟

چونکہ ہماری معاشی مفاسد کا سدباب اہم آج جن معاشی ناہمواریوں سے دوچار ہیں ان کے پیدا کرنے والے

مختلف وجوہ میں وہ تمام بڑے بڑے کاروباری مفاسد بھی شامل ہیں جو آج کی مارکیٹ کی رگ رگ میں خون بن کر گردش کر رہے ہیں۔ جب تک ان زہریلے عناصر سے کاروبار کے عروق و اعصاب کو پاک نہ کر لیا جائے ہم معاشی ناہمواریوں کی اصلاح پر کبھی قادر نہیں ہو سکتے۔

ان کاروباری مفاسد میں اولیں اہمیت سود کی ہے۔ ہمارا نظام معیشت سودی نظام معیشت ہے اور سود کا وجود اسلام کی عین نفی ہے۔ سود کو اسلام نے اقتصادی، اخلاقی اور قانونی ہر لحاظ سے حرام قرار دیا ہے۔ اور پھر سود کی حرمت کی نوعیت اتنی شدید بتائی گئی ہے کہ ایک مسلمان سوسائٹی کے لئے سودی نظام معیشت کا جاری رہنا ناقابل برداشت عذاب ثابت ہونا چاہئے۔ قرآن نے سود خواروں کو فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ کا پیغام سنایا یعنی خدا اور رسول کی طرف سے سود کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا پھر سود خواری ہی نہیں، بلکہ سودی معاملات کی دستاویزات لکھنے اور حسابات رکھنے کو بھی قابل مواخذہ جرم قرار دیا گیا۔ دوسری طرف حدیث نبوی نے سود کے جرم کا بھاری پن اور اس کے اثرات بد کی وسعت کو واضح کرنے کے لئے یہ حقیقت بیان کی کہ سود خواری کا گناہ ستر مرتبہ کی زنا کاری سے بھی زیادہ شدید ہے۔ حرمت ربوا کی اس نوعیت کو معلوم کر لینے کے بعد نبی صلعم کے صحابہ نے اپنے آپ کو نہ صرف ربوا سے پوری طرح بچایا ہے بلکہ ہر وہ معاملت جو بظاہر سودی معاملات نہ ہوں لیکن ان میں ربوا کا رنگ یا شائبہ پایا جائے یعنی سودی معاملات سے مشابہت رکھتی ہوں ان سے بھی پوری طرح اجتناب کیا۔

سود کی حرمت کی اس شدت کے محسوس کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لئے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ سود کی قسم بندیاں کرے۔ وہ پھر اس بات کی فقہی گنجائشیں ڈھونڈے کہ فلاں قسم کا سود اگر حرام ہے تو فلاں قسم کا سود کمانے کی شریعت مانع نہیں ہے۔ لیکن انحطاط پذیر ذہنوں نے یہ بھی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ شخصی سود خواری تو حرام ہے، بینکوں کے سود کو اسلام کیسے حرام قرار دے سکتا ہے جو کاروبار کی ترقی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور جو درحقیقت سود نہیں بلکہ منافع تقسیم کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں نہ صرف یہ کہ اسلام کو نہ سمجھنے کی دلیل ہیں بلکہ جدید معاشیات اور دور حاضر کے بینکنگ سسٹم کو نہ سمجھنے کی گواہی بھی دیتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بینک کے سود کی ماہیت پر چند باتیں عرض کر دوں۔

بنکوں کا سود بنک کے سود میں ٹھیک وہی خباثتیں پائی جاتی ہیں جو شخصی سودی معاملات میں ہوتی ہیں، اس کا ظاہر بدل جاتا ہے، باطن نہیں بدلتا۔ بنک کے سود کی حقیقت یہ ہے کہ بنک جن لوگوں کے سرمائے سے چلتے ہیں وہ اپنے لاکھوں اور کروڑوں روپے بنک کے کاروبار میں اس بھروسے پر لگاتے ہیں کہ ان کو ہر حال کے خاتمے پر اتنے فیصد منافع لازماً ادا کر دیا جائے، چاہے بنک کو نفع ہو یا نقصان، اور نفع ہو تو کم نفع ہو یا زیادہ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ بنک اپنے دفاتر اور ذخائر کے اندر سے تو یہ نفع نکال کر سرمایہ داروں کو دے نہیں سکتا اور نہ ان کے جمع کردہ روپے میں نسل کشی کی استعداد موجود ہے۔ بنک بہرحال ایک طرف سے لے کر ہی دوسری طرف دے سکتا ہے۔ چنانچہ کوئی بنک جب اپنا سرمایہ بڑے بڑے کاروباری اداروں اور صنعتی کارخانوں میں لگاتا ہے تو وہ بھی اسی اصول پر شرح منافع پہلے سے طے کر لیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرز پر کاروباری ادارے اور صنعتی کارخانے اپنی مصنوعات اور مال تجارت کی قیمتوں میں سود کی وہ رقم شامل کر دیتے ہیں جو بنکوں کی طرف سے ان کے ذمے آتی ہے۔ یہاں تک کہ سود کی بلا آخر کار ضروریات زندگی کے اس آخری عام گاہک کی جیب پر آپڑتی ہے جو اس کو کسی دوسرے پر پھینک نہیں سکتا۔ یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک ملک کے بنک کئی کروڑ روپیہ سالانہ کی جو رقم منافع کے نام سے اپنے حصہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہ اس ملک کے غربا اور عوام ہی کی جیبوں سے غیر محسوس طریق سے نکل کے آتی ہے۔ ایک سودی نظام معیشت کے تحت آپ بازار میں جا کر اگر ایک آنے کی شکر یا تین پیسے کی دیا سلائی بھی خریدتے ہیں تو اس ایک آنے اور تین پیسے میں بھی سرمایہ داروں کا وہ چندہ شامل ہوتا ہے جسے بنک منافع کے نام سے تقسیم کرتے ہیں۔ جس سوسائٹی میں بنکوں کا سود جائز قرار دیا گیا ہو اس میں کسی متقی ترین فرد کے لئے بھی یہ ممکن نہیں رہتا کہ اپنے دامن کو سود کے داغ سے پاک رکھ سکے۔ حرام کمایہ ہمہ گیر زہر حلال اور پاک اشیا میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ سودی نظام میں قدرتی طور پر اشیا کی قیمتوں کے ساتھ سود کا بار شامل ہو کر ان کو بوجھل بنائے رکھتا ہے۔ دوسری طرف ربائی معیشت ملک کے چند مالدار افراد کے پاس ساری دولت کو ہر طرف سے سمیٹ سمٹ کر لے آتی ہے اور اس کا نتیجہ خطرناک ناہمواریوں کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔

پس اسلام کے منشا کے مطابق اگر معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنا ہو تو سوسائٹی کو سود سے پاک کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ سود اگر کتاب و سنت کی رو سے حرام ہے تو اسے پاکستان کی اسلامی ریاست میں قانونی

سے بھی حرام بھی ہونا چاہئے۔

"وہ کی حرمت کو عملی جامہ پہنانے کا ذکر آتے ہی یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر سُود کو قطعی طور پہ ممنوع ٹھہرا دیا جائے تو بنکنگ سسٹم کا سرے سے خاتمہ ہو جائیگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بنکوں کے بغیر آج نہ تجارت چل سکتی ہے۔ اور نہ حکومت کے مالیات کا نظام ہی برقرار رہ سکتا ہے۔

یہ سوال یقیناً ایک وزنی سوال ہے۔ اور آپ کے سامنے جو لوگ سُود کی حرمت کا پیغام لا رہے ہیں۔ وہ اس سوال کی اہمیت سے غافل نہیں ہیں، لیکن وہ اس کو لاینحل نہیں سمجھتے۔ اور درحقیقت دنیا میں کوئی سوال لاینحل نہیں ہے بشرطیکہ کسی قوم اور حکومت میں اس کے حل کرنے کا سچا عزم موجود ہو۔ ایک ایسا گروہ جو اپنے اصولوں کا محافظ و پاسباں ہوتا ہے وہ ان کو قائم کرنے کے لئے سو راہیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اپنی دنیا آپ بنانے کا ولولہ موجود ہو اور خودی اتنی زندہ ہو کہ دوسروں کے در پر اصول و افکار کی گداگری کی ذلت کو گوارا نہ کر سکے۔ یہ اوصاف اگر کسی گروہ میں نہیں ہیں۔ تو اس کے لئے اس آسمان کے نیچے حقیقی آزادی نہ پہلے کبھی تھی اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔

اسلامی نظام معیشت آپ کو ایک نئے بنکنگ سسٹم کے قائم کرنے کے لئے سُود کے اصول کے بجائے مضاربت کا اصول مہیا کرتا ہے۔ اصول مضاربت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طرف کا سرمایہ اور دوسری طرف کی محنت باہم متعاون ہو کر کام کریں اور نتائج میں کسی طے شدہ تناسب کے مطابق دونوں شریک ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اصولِ مضاربت کے معنی حصہ داری نفع و نقصان[1] کے ہیں۔ اس اصول پر اگر بنکوں کو سرمایہ دیا جائے۔ اور اسی

---

[1] ایک صاحب نے مجھ سے کراچی میں یہ سوال کیا تھا کہ سرمایہ پر سُود دیا جائے یا منافع دونوں صورتوں میں واقعہ کی حقیقت میں تو کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ سو جس طرح سُود کا بار اشیاء کی قیمتوں پر پڑتا ہے، اسی طرح منافع کا بار بھی تو پڑیگا۔ پھر فرق کیا ہوا؟

اس کے جواب میں میں نے ان کی خدمت میں یہ عرض کیا تھا کہ سود کی مقدار چونکہ پہلے سے طے ہوتی ہے اس لئے وہ مصنوعات کے مصارف تیاری (Cost of Production) میں شامل کر دی جاتی ہے۔ لیکن حصہ داری منافع کے اصول پر جو سرمایہ صنعت میں لگایا گیا ہو۔ اس کی مقدار پہلے سے معلوم نہیں ہوتی اسلئے اشیاء کے مصارف تیاری میں شامل نہیں کیا جا سکتا بلکہ برعکس اس کے مارکیٹ کے رُو سے جب کسی سرمایہ پر نفع یا نقصان نمودار ہو چکتا ہے تب اس کی تقسیم ہوتی ہے۔ دوسرا فرق اصولِ سود اور اصولِ مضاربت میں یہ ہے کہ اول الذکر اصول کے تحت سرمایہ دار نفع تو لے لیتا ہے لیکن نقصان سے صاف بچ کے نکل جاتا ہے۔ لیکن دوسرے اصول کے تحت اگر وہ نفع لینا چاہتا ہے تو اسے نقصان کا بار بھی بہرحال اٹھانا پڑتا ہے۔ یہاں دو وجوہ سے اصول سود کا اصول مضاربت [illegible]

اصول پر اگر بنک تجارتی اور صنعتی اداروں کو سرمایہ فراہم کریں تو صنعت و تجارت کا سارا نظام بھی نہایت بہتر طریق سے چل سکتا ہے اور ان کے مالیات کو بھی نئے انداز سے استوار کیا جاسکتا ہے۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر داخلی ضروریات کے لئے اس طرح کا کوئی بنکنگ سسٹم چل بھی نکلے تو بہر حال بین الاقوامی مالی اور تجارتی روابط کے لئے یہ کارآمد نہیں ہوسکتا۔ اصولِ مضاربت پر ہم بیرونی سرمایہ حاصل کرسکتے ہیں اور نہ اس اصول پر چلنے والے بنکوں کو تجارتِ خارجہ کا وسیلہ بنا سکتے ہیں۔ ہم اس بارے میں یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کوئی بھی اصول جب تک اپنے گھر میں اختیار کر کے کامیابی کی منزل تک پہنچا نہ دیا جائے۔ اس کے لئے گھر سے باہر کبھی بھی قبولیت حاصل نہیں کی جاسکتی بہر حال ایک نئے بنکنگ سسٹم کو آپ چند سال میں اپنے ہاں پروان پڑھا کر اسے سودی سسٹم سے بہتر ثابت کریں گے۔ اور پھر اس کے حق میں مرغوب کن لٹریچر کی ایک بڑی مقدار دنیا کے ممالک کو فراہم کر دیں گے تب کہیں دنیا اس سسٹم پر اعتماد کر سکے گی، اور جب تک یہ منزل نہ آجائے آپ کو اپنے بین الاقوامی مالی و تجارتی روابط میں سود کی آلائش کو اضطراراً گوارا کرنا پڑیگا لیکن جب یہ منزل آجائے گی۔ تو شاید آپ کو وہ دن دیکھنا بھی نصیب ہوگا جب کہ آپ سرمایہ دار ملکوں سے یہ مطالبہ کریں گے کہ جسے ہم سے تجارتی و مالی تعلقات رکھنے ہوں وہ اپنے ہاں غیر سودی بنکنگ کو قائم کرے کیونکہ ہم سودی معاملات سے قطعی طور پر الگ ہوچکے ہیں۔ اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ہاں سے تربیت پاکر لوگ جائیں گے۔ اور اپنے ملکوں میں غیر سودی بنکنگ سسٹم کا نیا تجربہ کریں گے اور پوری دنیا پر آپ کا اصول مضاربت چھاتا چلا جائیگا۔

اس مہم کے سر کرنے میں جو مشکلات بیان کی جاتی ہیں وہ بہر حال اتنی ضرور ہیں جتنی ایک پرانے نظام کو چھوڑ کر نئے نظام کو برپا کرنے میں پیش آیا کرتی ہیں اور ان کو حل کرنے میں یقیناً عرق ریزی کرنی پڑیگی۔ آپ کے ملک کے علمائے دین اور علمائے معاشیات کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔ اور دو طرفہ معلومات کی روشنی میں اصول مضاربت پر بنکنگ سسٹم کے قائم کرنے کا منصوبہ تیار کرنا ہوگا پھر اس منصوبہ کے مطابق ابتداء چھوٹے پیمانے پر حکومت اپنی نگرانی میں تجربتہً ایک نیا بنک قائم کریگی جو پھر بتدریج پھیلے گا۔ یہاں تک کہ جب اس کا نظام چل نکلے گا تو آہستہ آہستہ دوسرے بنک اسی کے مطابق ڈھلنے شروع ہوجائیں گے۔ ان تجربات کے ساتھ ساتھ اسلامی بنکنگ کی نئی سائنس خود بخود ارتقا کریگی اور اس کے لئے لٹریچر مرتب ہوتا جائیگا۔ اور ماہرین فن تیار ہو کر میدان کار میں آنے جائیں گے۔ اس سلسلے میں اولین اقدام یہی ہے۔ کہ تبدیلی کا فیصلہ کر لیا جائے جس دن ہم سود کے شیطان کو ملک بدر کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس دن معاشی ناہمواریوں کی ایک بڑی علت کا خاتمہ ہوجائیگا۔

ذخیرہ اندوزی اور سٹہ: سود کے بعد دوسرے درجے پر جو فتنہ انگیز خباثت ہمارے کاروبار میں دخیل ہے۔ وہ ذخیرہ اندوزی اور سٹہ بازی کی ہے۔ موجودہ بگڑے ہوئے نظام کے تاجر عوام کی خدمت کر کے حلال روزی کمانے کے بجائے عوام کو دکھ دے کر حرام کمائی کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ نہیں کہ جس چیز کی کمی ہو رہی ہو، اسے فراہم کر کے حق الخدمت وصول کریں، بلکہ ان کی روش یہ ہے کہ جو چیز عوام کو آسانی سے مل سکتی ہو، اس کے ذخائر جمع کر کے روک رکھے جائیں۔ اور عوام کو اتنا مسکایا جائے کہ پھر ان کی جیبیں کاٹنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ یہ غیر فطری کمائیاں کرنے کا ایک ایسا ڈھنگ ہے جس کی وجہ سے سوسائٹی میں لازماً معاشی ناہمواریاں فروغ پاتی ہیں۔ موجودہ بنکنگ سسٹم نے اس ذخیرہ اندوزی کے جرم کو پیمانۂ کبیر پر عمل میں لانے کیلئے سہولتیں پیدا کر دی ہیں اور اس جرم کے لئے نقد سرمائے کی تنگ دامانی کو وسعت میں بدل دیا ہے کسی نقد سرمائے کے استعمال کئے بغیر ذخائر اجناس کو قید میں رکھا جا سکتا ہے پھر ان اجناس کے خیالی "بیع" خیالی "سودے ہوتے رہتے ہیں اور ہر سودے کا منافع ان کی قیمتوں پر اپنا بوجھ ڈالتا چلا جاتا ہے جو آخر کار عوام کی جیبوں پر جا کے پڑتا ہے پھر بڑے بڑے تاجر مل جل کر کاروباری گٹھ جوڑ قائم کر لیتے ہیں اور ذخیرہ اندوزی اور سٹہ بازی کی پوری فضاؤں پر چھا جاتے ہیں تو پھر منڈی اور کاروبار ان کے بے بس غلام بن جاتے ہیں۔ قیمتیں ان کے اشارۂ ابرو پر ناچتی ہیں، چھوٹے تاجر ان کی اجارہ داری کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ حکومت کے مالیات پر بھی یہ ہر طرح کا اثر ڈالنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔

یہ سٹہ اور ذخیرہ اندوزی کا نظام لازماً معاشی ناہمواریوں کو ترقی دیتا ہے۔ اور عوام پر بڑے بڑے تاجروں کی من مانی کمائیوں کا بوجھ ڈالتا ہے۔ اسلام ان دونوں مفاسد کا دشمن ہے اور اس کے نظام معیشت میں کاروبار کو جن اصولوں پر منظم کیا جائیگا ان کے فریم میں ان دونوں سرمایہ دارانہ اصولوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

دوسرے کاروباری مفاسد: ان دو بنیادی مفاسد کے علاوہ کاروباری دنیا میں اور بھی بہت سے وجوہ فتنہ پائے جاتے ہیں اور اسلام ان میں سے کسی کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اسلام کے ضابطۂ تجارت میں لین دین اور معاملات کی بہت سی ایسی شکلیں ممنوع ٹھہرائی گئی ہیں جو اجتماعی اخلاق کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں اور معاشی ناہمواریوں میں بھی اضافہ کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ان مختلف شکلوں کی تفصیل میں اس تقریر میں نہیں کر سکتا، فقہ کی کتابوں میں معاملات کے کئی باب ان کو محیط ہیں کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ اسلام کے کاروباری ضوابط کے اصول و حِکَم کو پیش نظر رکھ کر دورِ حاضرہ کے کاروبار کے پیچیدہ نظام کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا جائے اور ان میں جو مفاسد کارفرما ہیں ان کی روک تھام کے لئے اسلامی ذہنیت کے ساتھ جدید فقہ بندی کی جائے

<u>جاگیروں کا محاسبہ</u>: پاکستان میں جن ناہمواریوں کو نہایت شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے، ان میں اکثر و بیشتر وہ ہیں جو بنیادی زراعت سے متعلق ہیں پس پاکستان جیسے زرعی ملک میں زمین کے مسائل اپنے حل کے لئے اولیں توجہ چاہتے ہیں۔ ان مسائل میں سے ایک نمایاں مسئلہ جاگیروں کا ہے۔

اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے میں پوری صفائی سے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ جاگیروں کے مسئلے کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھنے پر کبھی تیار نہیں ہیں جو عام طور پر فضا میں رائج ہے۔ ہم اس معاملے میں جو کچھ رائے بھی قائم کر سکتے ہیں، اپنے علم کی حد تک اس کو کتاب و سنت کی ہدایت سے اخذ کرتے ہیں اور اگر کتاب و سنت کی رو سے ہماری رائے کی غلطی ہم پر واضح کر دی جائے تو ہر لحظہ اس میں ترمیم کرنے کو تیار ہیں۔ اسلام اگر کسی جاگیر کو جاگیردار کے پاس چھوڑنا چاہے تو چاہے ساری دنیا اس کے سلب کرنے کا فیصلہ کرے ہم بہرحال اس فیصلہ کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکیں گے، اور اسی طرح اگر اسلام ساری جاگیروں کو جاگیرداروں سے سلب کر کے حکومت کی تحویل میں لانے کا یا کسانوں میں بانٹ دینے کا اشارہ کرے تو چاہے کتنی ہی بڑی طاقتیں اس اشارہ کو جھٹلانے کی کوشش کریں، ہمارے نزدیک یہی اشارہ واجب التعمیل ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اصل مسئلہ کی طرف آیئے۔ نظام جاگیرداری کئی سو سال تک پوری دنیا پر مسلط رہ چکا ہے اور زمین کے بعض گوشوں میں اب تک اس کا چلن باقی ہے۔ خود پاکستان میں بھی اس کے آثار موجود ہیں۔ اس نظام کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ سلطان وقت یا حکومت اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ملک کے ایسے تمام با اثر اور نمایاں اشخاص کی وفاداریاں خرید لیتی ہے جو اگر تعاون کریں تو سلطنت مستحکم رہتی ہے اور بگڑ جائیں تو تخت کے پائے متزلزل ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی وفاداریوں کی خریداری کے لئے دوسرے مختلف ذرائع کے ساتھ ساتھ جاگیر کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جاگیر صرف ایک قطعہ زمین ہی نہیں ہوتی، بلکہ اس قطعہ زمین کے ساتھ کسانوں اور کمیوں کی ایک بڑی رعیت بھی ہوتی ہے جس کی آزادی اور حیثیت کو حکومت ایک با اثر شخص کی وفاداری کی خرید کے لئے داؤں میں لگاتی ہے۔ جاگیردار حکومت کو فوجی قوت بھی فراہم کرنے ذمہ دار ہوتا ہے، اور مالی قوت بھی ——— اور اس کے صلے میں وہ اپنے حلقہ اثر کے افراد انسانی پر خدائی کا حق حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح سے سالہا سال کے مسلسل عمل نے جاگیرداری کے ساتھ نہایت ذلیل اور گھناؤنی روایات وابستہ کر دی ہیں اور جہاں کوئی جاگیر پائی جاتی ہے اس کے ساتھ یہ روایات کسی نہ کسی درجے میں موجود ہوتی ہیں۔

مغلیہ دور حکومت میں جاگیر کی یہ نوعیت بکثرت پائی جاتی تھی لیکن اس کے علاوہ جاگیروں کی ایک قسم داد و دہش اور بخششیں

کی صورت میں بھی وجود میں آتی رہی ہے۔ ان دو قسموں کے علاوہ ایک تیسری قسم صلۂ خدمات کی بھی تھی یعنی حکومت بعض مواقع پر نقد تنخواہ یا انعام کے بجائے زمین اپنے کارکنوں کو تفویض کر دیتی تھی۔

انگریزی دورِ حکومت میں نظامِ جاگیرداری اپنی عمر کی آخری منزلوں میں داخل ہو گیا تھا، لیکن پھر بھی پہلے کی بے شمار جاگیریں موجود تھیں اور بحال رہیں۔ اور انگریز حکام نے بھی جاگیر کو وفاداریاں خریدنے کا ذریعہ بنانا اپنے لئے مناسب سمجھا، چنانچہ ایک نظامِ باطل کو عام ہندوستانی باشندوں کے علاوہ خود ملتِ اسلامیہ پر مسلط کرنے کے لئے جاگیر دار نے بے شمار لَاالٰہ خوانوں کو مجاہد بنا کر انگریز کے سامنے صف آرا کر دیا۔

جاگیرداریوں کی ان نوعیتوں کے سامنے رکھنے کے بعد جب ہم اسلامی نقطۂ نظر سے پیشِ نظر مسئلہ کو سوچتے ہیں، تو ہمیں تاریخِ اسلام سے اس بات کا ثبوت تو ملتا ہے کہ اسلامی حکومت نے اپنے کارندوں کو بعض اوقات معاوضۂ کار کے طور پر زمینیں تفویض کی ہیں لیکن ان کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کی ناپاک روایات کبھی نہ تھیں اور نہ ان کو اسلامی حکومت نے خدا کے بندوں کے حقِ آزادی، حقِ مساوات، اور حقِ معیشت کے سلب کرنے کا ذریعہ بننے دیا ہے لیکن خاص طور پر وہ جاگیریں جن کو ایک نظامِ باطل کے قیام و تسلط کے لئے استعمال کیا گیا ہو اور جن کو تجدید و احیائے دین کی ہر کوشش کو کچلنے اور اسلامی تہذیب کو شکست دینے کے لئے ذریعہ بنا لیا گیا ہو اُن کے بارے میں اسلام سے جواز کا فتویٰ بہر حال نہیں مل سکتا، علاوہ ازیں کہ مسئلہ اسلامی ریاست اور مسلم سوسائٹی کی کسی اجتماعی ملکیت کو شاعروں کے قصیدوں اور بھانڈوں کے لطیفوں پر لٹانے کی اجازت اسلام کے قانون نے کبھی نہیں دی چنانچہ حضرت خالد جیسے چوٹی کے قابلِ اعتماد حاکم نے جب ایک شاعر کو اس کے کلام پر دس ہزار درہم بطور انعام دیئے تو حضرت عمرؓ نے اس پر شدید گرفت کی، مقدمہ چلایا، اور اسی معاملے پر ان کو معزول کر دیا۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ پاکستان میں جو جاگیریں امتِ محمدی کے لاکھوں افراد پر ظلم کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور جن میں سے بیشتر وہ ہیں جو کسی جائز بنا پر وجود میں نہیں آئیں، کیا اُن کو سلب کرنے کے لئے اسلام میں کوئی سندِ جواز ہے؟ کوئی صریح آیت یا حدیث یقیناً اس سوال کا دو ٹوک جواب دینے کے لئے موجود نہیں ہے۔ لیکن اصولاً یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ایک ظالم حکومت نے اگر پبلک کے اموال و املاک کو ناجائز طور پر لٹایا ہو تو اس حکومت کی جانشین حکومت اس کے فیصلوں کو بدل کر اصلاح کر سکتی ہے۔ پھر خصوصاً معاملہ اگر امتِ مسلمہ کے اجتماعی اموال و املاک کا ہو اور انہیں کسی مسلم یا غیر مسلم حکمران نے اسلام کی ہدایات سے قطع نظر کر کے ظالمانہ طریق پر محض افراد کے نفع یا بعض حرام مقاصد کے لئے دے دیا ہو تو ایک

صحیح اسلامی حکومت وجود پاتے ہی سابق حکومت کے غلط تصرفات پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتی ہے۔

میرے اس دعوے پر خلافت راشدہ کے ایک سے زائد عملی نظائر موجود ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ :۔

(ا) عراق پر جب اسلامی حکومت کا قبضہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے خاندان شاہی کی ساری جاگیروں کو سلب کر کے اسلامی بیت المال کی ملکیت قرار دے دیا۔

(ب) رومی حکومت نے جب شام اور مصر پر قبضہ کیا تو تمام اراضیات اصلی باشندوں سے چھین کر درباریوں اور فوجی افسروں اور شاہی خاندان کے افراد کی جاگیروں میں بدل دیں اور کچھ کلیسائی معبدوں کے لئے وقف کر دیں حتیٰ کہ مقامی آبادی کے پاس چپہ بھر ملکیتی زمین بھی باقی نہ رہی بلکہ اصل باشندگان ملک خود اپنی زمینوں میں مزارعین بن کے رہ گئے۔ حضرت عمرؓ نے جونہی ان ممالک پر قبضہ کیا، تمام جاگیرداریوں کو اصل مقامی مالکوں کی طرف لوٹا دیا، بلکہ مقامی مظلوم باشندوں کی دلدہی کی خاطر مسلمانوں کو کسی زمین پر قبضہ کرنے یا کسی قطعۂ ارضی کے خریدنے سے خاص طور پر روک دیا۔

(ج) اوپر کی دونوں نظیریں اُن جاگیروں کے متعلق ہیں جو غیر مسلم حکمرانوں نے قائم کی تھیں۔ لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو خلفائے راشدین کی صف میں شریک ہیں، ان جاگیروں کے بارے میں بھی ایک قطعی نظیر قائم کر دی ہے جو مسلم حکمرانوں نے غلط مقاصد کے لئے قائم کی ہوں۔ آپ نے مسند آرائے خلافت ہونے کے بعد پہلا بڑا کام یہی کیا کہ تمام جاگیروں کے قبالے مسجد میں مجمع عام کے روبرو طلب کئے۔ پھر اپنے بیٹے کو پاس بٹھلیا جو ایک ایک جاگیر نامے کو پڑھتے جاتے تھے اور حضرت عمرؒ اسے کالعدم قرار دیتے جاتے تھے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنی اور اپنے اقربا کی جاگیروں کے قبالوں کو قینچی کے حوالے کیا۔ پھر شاہی خاندان کے دوسرے ارکان اور درباریوں کے قبالوں کو پرزے پرزے کیا۔ یہاں تک کہ کوئی جاگیر نامہ بھی سلامت نہ رہا۔ اس کارروائی کو دیکھ کر بعض لوگ تلملائے۔ اس پر ابن عبدالعزیزؒ نے اُن کو متنبہ کیا کہ خبردار! اگر میرے راستے میں روڑے اٹکاؤ گے تو میں اس خلافت کو جا مانتا مجھے سونپی گئی ہے سے جا کے مدینے کے عوام کے حوالے کر دوں گا! چنانچہ بڑے بڑے جاگیردار دم بخود ہو کے بیٹھ رہے۔ ان نظیروں کی روشنی میں ہم کو ان ساری جاگیروں کا محاسبہ کرنا ہوگا جن کے متعلق کاغذات مال وار اضی سے ضروری معلومات مل سکتی ہیں۔ پھر تمام ناجائز قسم کی جاگیروں کے قبالوں پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرح قینچی چلانی ہوگی۔ ظاہر ہے، کہ یہ ایک بہت ہی نازک ذمہ داری کا کام ہے اور اسے سرانجام دینے کے لئے علمائے دین کا ایک بورڈ جاگیروں کی نوعیتوں اور ان سے تعلق رکھنے والے مسائل پر جب تک خوب اچھی طرح چھان بین کر کے کوئی باقاعدہ پروگرام مرتب کر کے نہ دے محض اندھا دھند کوئی کارروائی نہیں کی جا

سکتی، کیونکہ یہاں قومی ملکیت کا اصول پیشِ نظر نہیں ہے، بلکہ سوال خدا و رسول کی ہدایت کے اتباع کا ہے۔

بقیہ زمینداریاں جاگیروں کا مسئلہ اگر صاف ہو جائے تو پھر پاکستان میں بہت تھوڑی سی بڑی زمینداریاں باقی رہ جاتی ہیں جن کو معاشی ناہمواریوں کے پیدا کرنے میں کچھ زیادہ دخل حاصل ہے۔ ان زمینداریوں پر فی الوقت اگر اسلام کے قانونِ وراثت کا ایک دور ہو جائے تو ان کے چار چار چھ چھ آٹھ آٹھ ٹکڑے ہو سکتے ہیں، اور پھر لمبی زمینداریاں شاید ہی باقی رہ جائیں گی۔ اسلام کے قانونِ وراثت کا عمل اگر بہت پیچھے سے کرنے کے لئے کوئی شرعی دلیل یا عملی نظیر موجود نہ ہو، تو بھی بہرحال آج جو لوگ زمینوں پر قابض ہیں اُن سے قانوناً یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان بننے یا قرار دادِ مقاصد کے پاس ہونے کی تاریخ کو ان کے پاس جو قطعات کسی متوفّی کے ترکے میں سے پہنچے ہیں، ان میں سے اپنا جائز شرعی حصہ رکھ کر بقیہ کو دوسرے شرعی وارثوں کے حوالے کر دیں۔ اس طرح بعض بڑی زمینداریوں کی کمر ایک ہی وار میں اور بعض کی آگے چل کے دوسرے وار میں ٹوٹ جائے گی۔

تین سالہ افتادہ زمینیں فقہ کا ایک قانون یہ ہے کہ اگر کوئی زمین تین سال تک افتادہ اور بنجر پڑی رہے اور اس کا مالک اس کو آباد کرنے سے قاصر رہے تو مسلم سوسائٹی کے ہر فرد کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس میں جا کر ہل چلائے اور اسے آباد کرے اور اس کا مالک قرار پا جائے۔ اسلامی حکومت کو یہ حق بدرجۂ اولیٰ پہنچتا ہے۔ یہ قانون نبی صلعم کے بعض فرمودات سے ماخوذ ہے اور خود خلافتِ راشدہ میں برسرِ عمل رہ چکا ہے۔ آج بھی اگر اسلامی نظام پاکستان میں قائم ہو تو یہ قانون دوبارہ زندہ ہو کے رہے گا اور پاکستان کے کئی لاکھ ایکڑ وہ بنجر رقبے جن سے ان کے مالک کوئی استفادہ نہیں کر سکتے غریب کسانوں کے لئے مباحِ عام ہوں گے کہ وہ ان پر قابض ہو جائیں یا اگر حکومت چاہے گی تو ایسے رقبوں پر قابض ہو کر اپنے انتظام سے ان کی آباد کاری کی کوئی اسکیم اختیار کرے گی۔

نجی جنگلات اور چراگاہیں بہت سی جاگیریں اور زمینیں نجی جنگلات اور چراگاہوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، حالانکہ شرعاً جنگلات اور چراگاہیں صرف خدا تعالیٰ کے لئے (اس کی نیابت کرنے والی حکومت کے ذریعے) مخصوص ہو سکتی ہیں، لیکن کسی شخص کو ذاتی طور پر جنگل اور چراگاہ کو مخصوص اور احاطہ بند کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور قانوناً اس قسم کی احاطہ بندیوں اور قبضوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی فقہ کا یہ قانون بھی بے شمار جنگلات اور چراگاہوں کو خاص ملکیتوں سے نکال کر عوامی ملکیت میں لا سکتا ہے اور معاشی ناہمواریوں کے دور کرنے میں اس سے بہت کافی مدد لی جا سکتی ہے۔

مزارعین کے حقوق مندرجہ بالا تدابیر کے اختیار کرنے سے زمینداروں کی خدائیاں بڑی حد تک کم ہو جائیں گی، اور مزارعین

اس قابل ہو سکیں گے کہ بے نیازانہ طور پر محنت کر کے اپنا حق وصول کریں لیکن پھر بھی مزارعین کو اسلام کے منشا کے مطابق پورے حقوق دلانے کے لئے خاص تدابیر اختیار کئے بغیر کام نہ چلے گا۔

آج ہمارے ہاں کے کاشتکار کی ایک ہی مشکل نہیں ہے کہ وہ پوری محنت کرنے کے باوجود زندگی کی کم سے کم ضروریات تک فراہم نہیں کر سکتا۔ بلکہ اسے زمیندار کی حد اور ندوم کے سامنے ایک ذلیل قسم کی غلامی و عبودیت کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ اسے نارروا قسم کے ٹیکس دینے پڑتے ہیں، اسے بیگاریں دینی ہوتی ہیں، اسے اپنے اسلامی حقوق اخوت و مساوات ہی نہیں عام انسانی شرف و آبرو تک زمیندار کی نذر کرنی پڑتی ہے۔ اسے بیٹھ پر کوڑے کھانے پڑتے ہیں، اسے چھوٹے چھوٹے مقدمات میں مبتلا کیا جاتا ہے اسے بلا کسی نوٹس کے بیک بینی و دو گوش زمینداری کی حدود سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ اس کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اور ان کی عصمتوں سے کھلم کھلا چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے۔ یہ حالات ایسے دردناک ہیں کہ ان کو دیکھ کر بہت سے نوجوان اپنا ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکتے اور ان کو انصاف کی راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ زمیندار سے زمین چھین کر انہیں مزارعوں کے حوالے کر دیا جائے جن کے لئے وہ ظلم کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔

لیکن ہم ایک مسلم کا ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے مزارعین کو ان کے جائز حقوق کے واپس دلانے کی جائز تدابیر اختیار کرنے کے پابند ہیں۔ مزارعین کے اسلامی حقوق ان کو واپس دلانے کے لئے اولین ضروری تدبیر یہ ہے کہ معاوضہ محنت کے لئے اسلام کے اصول کفالت کو قائم کر دیا جائے یعنی جس کی پوری محنت لی جا رہی ہو اس کا کم سے کم معاوضہ اتنا ہونا چاہئے کہ اس کی اور اس کے کنبے کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔ زمین کی کاشت سے تعلق رکھنے والے کاموں کے علاوہ کسان سے کوئی دوسرا کام اس کے رضا کارانہ فیصلے کے بغیر یا اسے معقول معاوضہ دیئے بغیر نہ لیا جا سکے۔ اگر کوئی زمیندار مار پیٹ کرے تو اسلام کے اصول عدل کے مطابق مظلوم کے ہاتھ سے خود اس کو پٹوا دینا اسلامی حکومت پر لازم ہو۔ کسان سے پیداوار کے مقررہ حصے کے سوا کسی قسم کے ٹیکس کی وصولی کا زمیندار کو کوئی حق حاصل نہ رہے۔

علاوہ بریں اس بات کا اہتمام کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمینداروں اور مزارعین کے درمیان سارا معاملہ تحریراً ہو اور معاملہ کی ضروری شرائط قلمبند ہو جائیں۔ نیز فریقین کا معاہدہ ایک متعین مدت کے لئے ہو۔ تاکہ ایک کسان ناگہانی طور پر بے دخل کئے جانے کے خطرے سے آزاد ہو سکے!

لہ ایک اسلامی حکومت زمیندار اور کسان میں پیداوار کی تقسیم کا تناسب بغرض اصلاح قانوناً بھی متعین کر سکتی ہے۔

مادی حقوق کو بحال کرنے کی ان تدابیر کے ساتھ ساتھ مزارعین کے اخلاقی حقوق کو بحال کرنے کے لئے ان میں اسلامی ذہنیت کے پیدا کرنے اور ان کی کچلی پسی ہوئی خودی کو چونکانے کے کام میں ایک عرصے تک تعلیم بالغاں کے مختلف ذرائع سے مدد لینی پڑے گی یہاں تک کہ وہ اپنے شرف کا احساس کریں اور روٹی کمانے کے لئے اپنی عزت میں کسی کمی کو گوارا نہ کریں۔ اس تعلیم و تربیت کی کامیابی صرف اسلامی حکومت کے سائے میں یقینی ہوسکتی ہے، جس کا بیت المال ہر وقت ایسے کسانوں کی کفالت کے لئے تیار رہے گا جن کو اپنے اسلامی حقوق سے ہاتھ دھوئے بغیر روٹی ہاتھ نہ آسکے۔ لیکن اپنے خداداد اسلامی حقوق میں وہ کوئی کمی کرنے پر راضی نہ ہوں ہمیں اپنے مزارعین کو یہ سکھانا ہوگا کہ وہ زمیندار کو تنے ہوئے قد کے ساتھ مسلمانوں کی طرح السلام علیکم کر سکیں، وہ نماز میں کسی جھجک کے بغیر اس کے برابر کھڑے ہو جائیں اور وہ اس کے رو برو برابر سرابر کی ایک آبرومندانہ نشست پر بیٹھ سکیں، وہ اس کی غلطیوں پر علم کھلا اسے ایک مسلم کی طرح ٹوک سکیں اور احکام خداوندی اور سنت نبوی کی تیغ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کر سکیں، یہ تربیت اگر حکومت کے ذرائع و وسائل سے ہو تو چند سال میں زمیندار کا نقشہ بدلا ہوا ہو سکتا ہے۔ اور اسے محسوس کرایا جا سکتا ہے۔ کہ آنجناب کا مقام خدا کے بندوں ہی کی صف میں ہے!

(باقی آئندہ)